شجاع خاور کے تین شعری مجموعے۔

1۔واوین۔ 2۔ مصرعہ ثانی۔ 3 ۔دوسرا شجر

شجاع خاور
دوسرا شعر

دوسرا شجر

شجاع خاور

پبلشرز:- اردو پبلیکیشنز ۲۱۴۸ اردو بازار دہلی ۶

بار اوّل ______ جنوری ۱۹۷۰ء
تعداد ______ ایک ہزار
قیمت ______ تین ۳ روپے
کتابت : ایچ اے حفیظ
(مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)

شجاع الدین خاں کے نام

جس کے چہرے سے دردِ زہ کے
اضمحلال کے اثرات کبھی کبھی مجھے
بڑھتا دیکھ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

شجاع خاور

یہ گریزاں نظر پریشاں سہی

ہر بلند و بلیغ سے بیزار

جانے کس روشنی پہ چھائیگی

کون سی رفعتوں پہ جائے گی

کس خدا کو زمیں پہ لائے گی

یہ گریزاں نظر پریشاں سہی

Scanned with CamScanne

الف ب ج حسب
اپنے انداز سے سمندر کے آئینے میں
اپنے چہروں کو چاٹ رہے تھے ——
اس کنارے پر ایک شکل ابھرتی ہے۔
ان کے اچھے مگر
کمزور چہرے
پگھلنے
لگے۔
سمندر
کا آئینہ
اپنی ہی لہروں پر
بہتے بہتے .....
ش

اب ادھر سے ایسا ہی ایک

چہرہ ابھرے جو سمندر کے آئینے کو

اندھا کر دے جو الف بھی ہو اور ب

بھی ــــ الف اور ب نے اپنے اپنے

چہرے تیاگ دیئے کہ یہ

گمبھیر

چہرہ

الف بھی ہے

اور ب بھی

ج

الف زمین پر قدم جمائے گفتگو کرتا تھا اور ب بھی۔ ان کی آوازیں
ان کے چہروں سے سونگھی جا سکتی تھیں۔ سب کچھ زمین سے
اٹھتی ...... ہوئی ہوا کی لہروں کے ارضی مفہوم کا
مرہون منت
ا
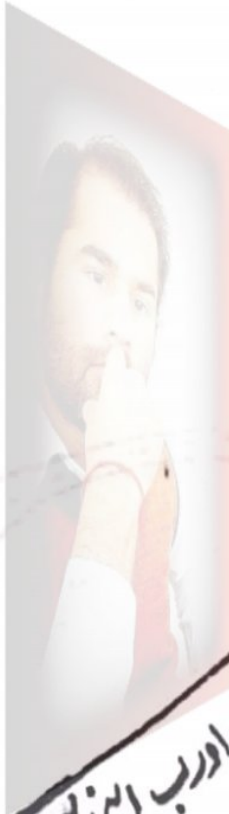
الف اور ب کے الفاظ اپنی اپنی جڑوں سے اکھڑ کر راستے کے لگ گئے ہیں۔ الف اور ب اپنی آوازوں کے ساتھ ٹوٹتے ہیں
وہاں ایک دوسری آواز ناچنے لگتی ہے۔
ع
الحمد لائبریری

آوازوں کے
قدم اکھڑ اکھڑ کر
اوپر اٹھے۔ زمین
دور ہو گئی۔ یہ آوازیں
ٹوٹ کر لٹک گئیں۔ آوازہ بننے کے لیے
ب۔ الف کے دائیں ب ج
آگے پیچھے س ش ص سب اپنے
قدموں سے خود کو پیچھے رکھتے ہوئے
پہاڑ پر سرنگوں سا چڑھ رہے
تھے۔ الف کی دنیا
یہ۔ ب کی دوسری
اس کی تیسری۔
الف کا قدم یہاں
ب کا اِدھر
ش کا یہاں
س کا اُدھر

خ

سب کے
قدم
پہاڑ سے گُم ہو گئے ہیں
پہاڑ کے ادھر چوٹی کے بجائے کچھ اور دکھائی دیا ہے سب کے قدم اپنی
چاہوں سے بچھڑ گئے ہیں
سوچنا چاہتے ہیں۔
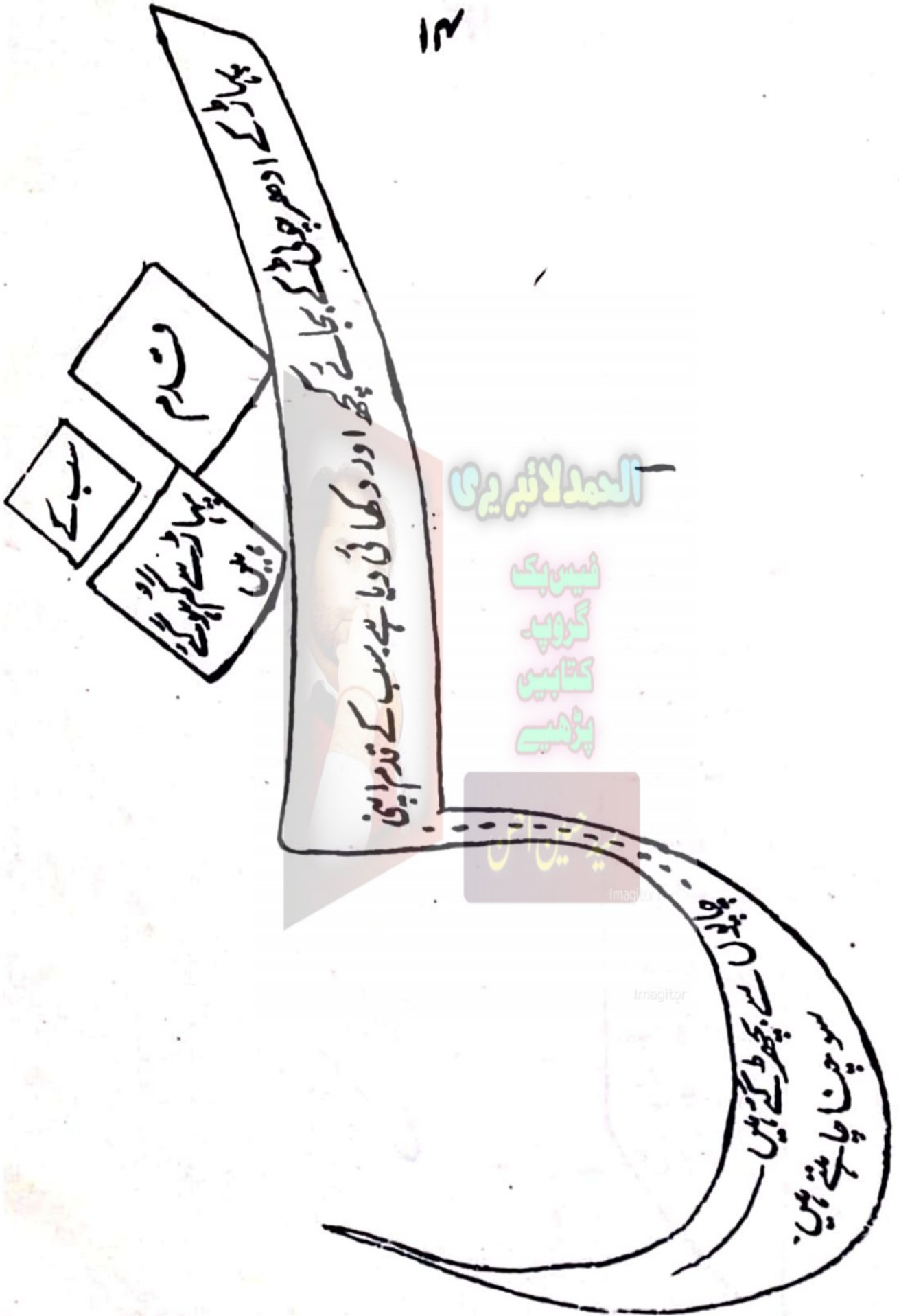
سوچ کے بدنما مگر
بڑے ملک
میں نہیں چلتے
محسوسات کے سکّے اپنی دنیاؤں کے ساتھ کھوٹے ہوتے جاتے ہیں
پُر خوبصورت مگر چھوٹے سکّے
و

پھر بھی وہ یہ تو جانتا ہوگا
آگہی ۔ ہاں وہی قلوپطرہ
آج مجھ سے ہوئی ہے ہم آغوش
میری جنت یہ آگہی کا محل
آگہی وہ مری قلوپطرہ
کبھی جس کے درِ شبستاں سے
میں نے پردہ اٹھا کے دیکھا تھا
اور میرے خدا نے جنّت سے
مجھے باہر نکال پھینکا تھا
میری معصومیت کی یہ لغزش
سرکشی کا گناہ ہو جیسے
اس کی پاداش مل گئی تھی مجھے
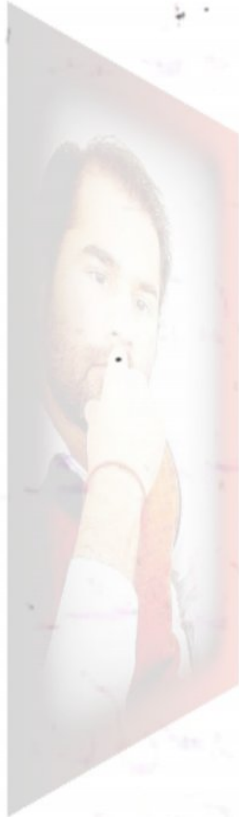
یعنی جنت بدر ہوا تھا میں

(یہ نمدا اسے بہشت کہتا ہے)

سوچتا ہو گا اب بھی میرا خدا

آج تک کشتۂ عتاب ہوں میں

مجھے اب وہ بہشت گم گشتہ

اور قدموں تلے کی یہ جنت :

نیند کی آنکھ سے کوئی بچہ

خواب زاروں کی سرد وادی میں

کوئی جنت نما محل دیکھے

پھر کوئی بد نہاد عفریت آئے

خواب زاروں کا وہ حسین محل

۲۰

اس کے ہاتھوں سے چھین کر لے جائے
اور سوتے میں روتے بچے کو
ایک ارضی چمن سے کوئی ماں
ایک حسین پھول توڑ کر دیدے
جیسے جنت نما محل کا غم
اس حسین پھول سے غلط ہو جائے

جنتِ گم شدہ کا غم کیوں ہو
میں نے بھی اک بہشت ڈھالی ہے
خواب زادوں کی بات کیا معنی!
میری جنت ہے چشمِ وا کی طرح
میری جنت میں خاک کا بستر

۳۰

میری جنت میں نہریں پانی کی

یہ فلک بوس ہی نہیں ہے صرف

میری جنت میں ہر بلندی ہے

میری جنت بہت ہی اونچی ہے

میری خودداریوں کے سر کی طرح

ہائے یہ بے بہا فسوں کاری

یہ مری کاوشوں کی نیاری

یہ مری فتح مندیوں کے نشاں

جن پہ ہوتا ہے بس مرا ہی گماں

بھول جاؤں اگر کہ یہ سب کچھ

میرے ہاتھوں کی نقش کاری ہے

خود مجھے لمحہ بھر کو ان کے حضور

۴٠

ایک احساسِ کمتری ہوجائے ۔

وہ بھی جنّت تھی یہ بھی جنّت ہے
پھر بھی اک فرق ایک فاصلہ ہے
وہ جو جنت تھی خوابِ زاروں کی
ہیں تو جزوِ حقیر تھا اس کا
اور یہ جنّت تمام میری ہے
ہیں جہاں بے شمار حوّائیں
ہائے یہ بے شمار حوّائیں
یہ سراپا گناہ حوّائیں
جن کی ترغیب پر میں ہو کے سوار
اور بھی جنّتوں میں جا پہنچوں

کیا خدا اب بھی سوچتا ہو گا

آج تک کشتۂ عتاب ہوں میں

ہوں تو جنت بدر مگر پھر بھی
مطمئن ہوں بفیض خود میں نے
ایک جنت یہاں بنالی ہے۔

جب سے یہ میری چشمِ وا کی بہشت
میری آنکھوں سے بات کرتی ہے
سرکشی سے مجھے لگاؤ سا ہے
خودسری سے مجھے محبت ہے۔
آہ فطرت کے یہ حسیں نشہکار
کہ ہیں بطنِ ازل سے شکل پذیر

اور ان سے نظر ملاتے ہیں
ان کے سائے میں جیسے کھاتا ہے
ایک احساسِ کمتری مجھ کو
اور میں شرمگیں نگاہوں سے
اس خدائے بہشت کا اب بھی
شکر کرتا ہوں پھر بھی لازم ہے
سرکشی کو پناہ میں رکھوں
خودسری کو نگاہ میں رکھوں

اب یہ کہنے میں بات جاتی ہے :-
کوئی لغزش نہیں ہوئی مجھ سے
ہاں بیانگ بلند کہتا ہوں

Scanned with CamScanner

مجھ سے لغزش ہوئی ہے کبھی میں
اس پہ نادم تو ہو نہیں سکتا۔
سرکشی کو گناہ کرنا تھا

خود سری نے خود اختیاری میں
اس کا واحد جواز ڈھونڈ لیا
اب مری خود سری یہ تندرخی
کیسے نادم ہو کیوں خجل ہو جائے

وہ قلوپطرہ میری ہم آغوش
حسن کے نا آشنا شبستاں میں
ایک بے نام سے تقاضے پر
کبھی جنّت بدر ہوا تھا میں
آج ہیں نیم خواب نیم دراز

اس کی سانسوں کے شور میں گم ہوں
صبحِ نازائیدہ کے پرتو میں
میں جب اپنا مآل دیکھتا ہوں
آگہی یہ مری قلوپطرہ
مجھ سے کچھ اور کھلنے لگتی ہے
اور میں پھر ذرا جواں ہو کر
اس کی سانسوں میں ڈوب لیتا ہوں
اس کی سانسوں کا زیر و بم مجھ کو
ایک احساسِ فتح دیتا ہے
اور کچھ ڈوبتا ہوں میں ــــ لیکن
اس کی سانسوں کی تہ نہیں ملتی
مثلِ حیوان ہو کے نااندیش

آگئے آئی ہوئی غذا پر میں
بیقراری سے ٹوٹ پڑتا ہوں
اور میرا خدا سمجھتا ہے
آج تک کشتۂ عتاب ہوں میں

آفریں ایسے پائے لغزش پر
جس کی معتوب لڑکھڑاہٹ بھی
آگہی کے محل میں لے جائے
آگہی — ہاں مری قلوپطرہ

طفلکِ شیر خوار

اپنی مادر کے سینے پہ ہو کر سوار
ایک معصوم سی سرخوشی میں مگن
خوب کلکاریاں بھر رہا ہے۔
کبھی زعمِ ہستی کے میٹھے نشے میں
کبھی ناگواری کے انداز میں
سر ہلاتا ہے یوں
جیسے آغوشِ مادر سے بیزار ہو
اور فوری خلاصی کی مبہم سی خواہش کی تکمیل کی آرزو
اس کے شفاف دل کو مکدر کیے جا رہی ہو

مادرِ مشفق و مہرباں
اس کی کلکاریوں میں ہے کھوئی ہوئی
طفلکِ شیر خوار
ایک انجان سے جذبۂ خود نمائی کی آواز میں
مادرِ مشفق و مہرباں کو کچھ ایسے بلاتا ہے
اور اس کی پستان سے ہو کے سیراب
اک ناگواری کے انداز میں اس طرح دیکھتا ہے
کہ بس شیر خواری پہ مجبور ہو!

آدمی کے تنزّل کی خاشاک سے
ہاں گناہ ازل کے ثمر کی دبی راکھ سے
خونفشاں گرم انگارے اٹھ کر

حقیقت کی بیباک تصدیق کرتے ہیں

ہاں یہ حقیقت ہے، زندہ حقیقت

کہ یہ آدمی کچھ ہماری ہی تاثیر کا ایک پرتو ہے

دلیکن یہ پرتو! کہ اپنے ہی مرکز سے

بڑھتا چلا جا رہا ہے

ہمیں دیکھنا تھا یہی

اپنی سوچوں پہ کوئی بھی حدبندی اس کو گراں ہے

یہ جب سوچتا ہے تو آزاد ہوتا ہے

ہر قید سے

ہر روایت سے

قیدِ زماں سے

حدودِ مکاں سے

Scanned with CamScanne

ہر اک خوف سے
ہر عقیدے سے
اور خود ہمارے تصور سے بھی !

پھر بھی ہم تو خدا ہیں
خدائے زمیں ہیں خدائے زماں ہیں
ہماری نظر میں یہ کرمِ حقیر
اس کی آنکھیں ہماری نظر سے ملیں
یہ ہماری خدائی کو ہرگز گوارا نہیں
آدمی — یہ ہمارا بنایا ہوا آدمی
خود فریبی میں جو
اپنے احساس کی شورشوں کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے

یہ شوریدہ سر

خود سری، سرکشی، تندروی کے قدموں میں

خود اس کے احساس کا ایک شوریدہ سر رہا ہے

یہ خود اس گراں بار احساس سے آج رو کش ہے

کترا رہا ہے

کہ یہ ایک شوریدہ سر بھی ہے

صرف ایک خود سر نہیں ایک سرکش نہیں

اس کی خود ساختہ یہ بہشت کبیر

اس کا زنداں ہے

اور آدمی ـــــــ بیکراں آدمی

اپنی خود ساختہ اور حقیقی بہشت گراں قدر میں

قید ہے۔

اس گرانبار احساس کا ایک شوریدہ سر
کر ہی دے گا اسے نیم جاں

ہم کبھی بھول سکتے نہیں
آدمی جو ہمارا گنہگار ہے
ایک مجرم نخا یہ
ہم نے اپنی خود آثار قدرت کے گنج گراں مایہ
پھر بھی دیئے تھے اسے
آج خود اک بہشت کبیر اس نے تعمیر کر لی ہے
کیا یہ بہشتِ کبیر اس کا زنداں نہیں ؟
اب جبینِ خدائی بھی زور شکن سے تنی جا رہی ہے
کہ اب ہو گئے ہیں ہم

اس خود نگر آدمی کے رقیب
ہم خدائے زمیں
ہم خدائے زماں

ہمارے بحر و بر دشت و جبل تو رزق تھے اس کا
ہماری رحمتوں سے ہی تعلق تھا کبھی جس کا
پر اس کو شکوۂ کوتاہیِ پرواز کرنا تھا
رقابت کا ہمیں بھی کچھ نہیں آغاز کرنا تھا
اگر یہ چوں چرا کے خارزاروں میں نہ آجاتا
زباں دانی کے زہر آلود اشاروں میں نہ آجاتا
تو ہم تسکیں کے دروازے پھر اس پر کھول سکتے تھے

ہمارے بحر و بر اس کی زباں میں بول سکتے تھے ۔
مگر اس نے ہماری آن کو مجروح کر ڈالا
طلسمِ رنگ کو بے رنگ اور بے روح کر ڈالا
ہم اس کے زعمِ خود کاری کا دامن چاک کر دیں گے
سزائے جرمِ این و آں ۔ جلا کر خاک کر دیں گے
اسے ہم علم کے لپکے ہوئے شعلوں میں جھلسا دیں
جو چاہیں تو خود اس آگہی کے خوں میں نہلا دیں
یہ خود بیں، خود نگر، خود آشنا سرکش ۔ مگر مجبور
یہ اپنی جنّتِ خود ساختہ میں ہے مگر محصور
اگر یہ بات اس کو آج بھی محسوس ہو جائے
تو ہو کر خاک اپنے آپ میں محبوس ہو جائے ۔
حقیقت ہے کہ ثبت ہیں ہمارے سارے موجودات

ہماری ہستیٔ خود آفریں اثبات ہی اثبات
زمیں پر آدمی کی سب کی سب آرائشیں منفی

ہمارے بحر و بر مثبت ہیں اس کی کاوشیں منفی
زمیں کے تنگ سینے سے نکلتی وہ بہشتِ نو
کبھی اس کے راندۂ فردوس کی وہ سرگذشتِ نو
ہمارے حسن کی پیہم نفی کی اک کہانی ہے
یہ پھر بھی نقشِ اول ہے وہ پھر بھی نقشِ ثانی ہے
یہ سارے کوہ و دریا بحر و بر دشت و جبل سب کچھ
اُمڈتے گونجتے سیلاب طوفانوں کا بل سب کچھ
یہ باد و برق و باراں سب زمیں پر قہرماں ہوں گے
ہمارے ترجماں ہوں گے ہمارے ترجماں ہوں گے
حقیقت ہے کہ پہلے بھی ہمارے ترجماں ہی تھے۔

یہ سب طوفان پہلے بھی زمیں پر قہرماں ہی تھے
مگر وہ علم آدم زاد وہ سنگین تدبیریں
وہ اس کے حکمت و اعجاز کی پُرپیچ زنجیریں
وہ منصوبوں کی یلغاریں وہ خودکاری کی تلواریں
اور ان سب پر ہمارے ترجمانوں کی یہ للکاریں
ہوئی جاتی ہیں ان سب کا تضاد آہستہ آہستہ
چلا آتا ہے اک شورِ عناد آہستہ آہستہ
ہم اپنی نعمتوں کو در پئے بیداد کر دیں گے
بہشتِ نو میں اپنے قہر کو آباد کر دیں گے
ہم اس کی کاوشوں کے زعم کو سوخت کر دیں گے
کہ اس کے علم سے اپنا تصادم سخت کر دیں گے
مگر یہ کیا ؟! ہمارا قہر جبّاری حزیں کیوں ہے !

نہیں !؟ تو پھر کسی بے بس کی صورت خشمگیں کیوں ہے ؟

آپ جل جائیگا خود سوز پتنگے کی طرح
حکمت و علم کے جلتے ہوئے میدانوں میں
کر کے محروم اسے دل کی خنک کاری سے
پھونک ڈالیں گے دماغوں کے بیابانوں میں

آدمی خارجی خطرات پہ چھا نا جائے
ہم اسے اس کی حرارت سے جلا سکتے ہیں
خود اسے اس کی پناہ گاہ میں گم کر دیں گے۔
ہم اسے اس کی نگاہوں سے چھپا سکتے ہیں

ہو کے رہ جائے گا جب عقل و خرد کا فتنہ
اور ادراک کے طوفان میں پھنس جائے گا۔

احتیاط اور تدبّر کی عملداری میں
ایک بے وجہ تبسّم کو ترس جائے گا

اپنی تقدیرِ ازل کے ورقِ سادہ پر
کیوں یہ الفاظ و معانی کئے جاتا ہے رقم
ہم سمجھتے تھے کہ سادہ ہی رہے گا یہ ورق
کیوں اب اس راندۂ جنّت نے سنبھالا ہے قلم

آدمی راندۂ فردوس۔ یہ لوح سادہ
علم و ادراک کا شیطان ہوا جاتا ہے۔

ہم نے معتوب کیا تھا اسے سادہ رکھ کر
یہ تو تحریر سے قرآن ہوا جاتا ہے

ہم یہ الفاظ یہ تحریر نہ کیوں الجھا دیں
آدمی اپنے ہی الفاظ سے سر پھوڑے گا
جب اسے اپنی ہی تفہیم گراں گذرے گی
ہو کے بیزار یہ تب اپنا قلم توڑے گا
جس زمیں کو کبھی رحمت کی اماں بخشی تھی
اس زمیں پر ہی کہ پیمانہ نظر رکھیں گے۔
ہاں اب اس راندۂ فردوس کی جنت پر ہم
بہر انداز رقیبانہ نظر رکھیں گے۔

۱۵۰

"آدمیت" کے نمائندہ گرانبار اصول
اس کے بے ضابطہ رجحان سے ٹکرائیں گے
مصلحت زاد ہمارے یہ خدائی احکام
اس کے خود آفریں وجدان سے ٹکرائیں گے

وہ تو کچھ "حکمتِ اخلاق" نظر رکھتی ہے
ورنہ یہ آدمی کچھ اور جواں ہو جاتا
یہ کہن سال عتاب ایک زباں بندی ہے
ورنہ یہ اور رواں اور رواں ہو جاتا

اس کی نو زائیدہ بیباک نگاہی کا رقیب
رحمت انداز ہمارا یہ کہن سال عتاب

Scanned with CamScanner

اب یہ خود اپنے ہی جلوے کو ترس جائے گا
اس کی آئینہ رخی اور یہ نہ دار حجاب،

ہاں ابھی اور سزا اور سزا اور سزا
اور ابہام کے پردوں کو اٹھا دیں گے ہم
اس کی آنکھوں میں چبھو دیں گے اجالے کی کرن
اس کے ہیجان کو کچھ اور بڑھا دیں گے ہم

آگہی کرب کی دیوار کا دل۔ (فردِ جرم)
یہ قلوپطرہ کہ آدم سے ہوئی ہم آغوش
ہم اسے اور حسیں اور جواں کرتے ہیں
اور ٹکرائے گا سرہوش کے عرفان کا جوش

اور سہمے گا یہ اب خفّت ناکامی سے
اور بڑھ جائے گی کچھ ساز تجسس کی بھی لے
غیر ممکن ہے قلوپطرہ کی سانسوں کا شمار
آگہی جرم بھی ہے جرم کی تعزیر بھی ہے۔
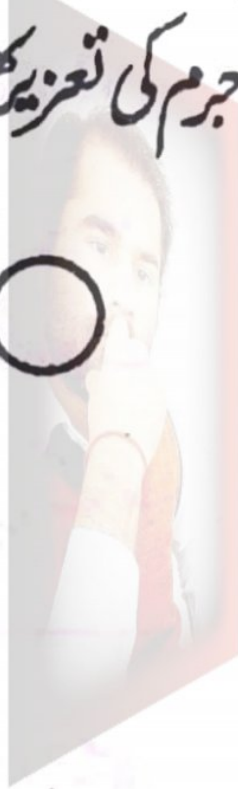
ایک خدشۂ موہوم ایک جبر نامعلوم
ساعتوں کے سینے کو پائمال کرتا ہے
اک سکونِ جاں فرسا دل پہ حکمراں، جیسے
شورشِ زباں دانی شورِ حمد میں گم ہو
رحمتوں کی یلغاریں ہیبتوں کی دیواریں
سرکشی کی ہمت کو پست کر گئیں، جیسے
ہیبتوں کی دیواریں، معبدوں کی محرابیں
شوقِ سجدہ ریزی کو دے رہی ہیں آوازیں
ہر عضوِ جان و تن مائلِ ثنا خوانی
اور ادھر نہ جانے کیوں اک نوائے طفلانہ

آتی ہے دبے پاؤں ذہن کے دریچے میں:

سجدہ ریزیوں کا نام سجدہ ریزیاں رکھنا

ناگزیر ہو تو ہو ناگوار بھی تو ہے ۲۹۰

آؤ سجدہ ریزی کو کہہ لیں اب خدا سازی

سیر یہ بحرِ بے پایاں جس کا بے بہا موتی

میرا ذہنِ لاہوتی جس کا حاصلِ پرواز

یہ بہشتِ نو جس پر آج ناز ہے مجھ کو

بے بسی کی خفت سے شرمسار ہونا ہے

جب مری یہ دُکھتی رگ یعنی تن یہ میرا تن

مادّی خدائی سے تھک کے ہار جانا ہے

یہ تو پھر بھی اچھا ہو گر نجات مل جائے
لیکن اس طرح مجھ کو کیوں نجات مل جائے
(ذہن پھر بھی رہتا ہے حقّتیں اٹھانے کو) ۳۰۰
ہاں یہ بادِ سرد و گرم ایک صورِ اسرافیل
جب مرے رگ و پے سے خون کھینچ لیتی ہے
اور جب خموشی کی زد پہ آ کے گرتا ہے
زندگی کا آوازہ — یہ بلیغ آوازہ
بے بسی کی لے میں پھر بادی خدائی سے
احتجاج ہوتا ہے التجا کے پردے میں
کب یہ سر اٹھانے کا مجھ میں حوصلہ ہو گا
ہائے کب مرے سر سے میرا تن جدا ہو گا
اور ادھر مری میراث یعنی یہ مرا احساس

Scanned with CamScanner

جیسے آخری خواہش بدنصیب مجرم کی   ۳۱۰

لیکن آخری خواہش جس سے اذن مل جائے

ایک بار حاکم کی مطلق العنانی سے

بدنصیب مجرم کو بازپرس کرنے کی

مسندِ عدالت پر بیٹھ کر مرا احساس

آج میرے حاکم کی مطلق العنانی سے

خود مری سزاؤں کا احتساب کرتا ہے

مطلق العنانی پھر مطلق العنانی ہے

لاجواب ہے پھر بھی احتساب جاری ہے

ساعتوں کا یہ حاکم یعنی یہ مرا احساس

مطلق العنانی کو مطلق العنانی پر   ۳۲۰

شرمسار کرتا ہے لاجواب کرتا ہے

خفت خجالت سے شورش ندامت سے!

اُف یہ مصلحت زادے! یہ اصول ہیں صالح
جن کے جال میں آکر جنکے سائے میں پل کر
رحمتیں بھی ایذا کوش سرکشی بھی چشم آشوب
انکی آندھیوں کا شور انکے زلزلوں کی خاک
سارے آئینہ خانے ہو گئے ہیں گرد آلود۔
جیسے اپنی صورت کا دیکھنا بھی مشکل ہے
جذبۂ رہائی پر یہ نگاہ یزدانی ـــــ
جانے کب سے جابر ہے کب سے ظلم کرتی ہے
ضابطوں کی یہ سازش جانے کب سے ہوتی ہے

اپنی "حکمتوں" کے حکم اور ان کی پابندی

انکی "عظمتوں" کا ہاتھ گھونٹتا ہے دم کیا کیا

اضطرابِ خود سوزی لاعلاج ہونا ہے

سلب ہوتی جاتی ہے جیسے قوتِ پرواز

جیسے سُن نہیں پائے کوئی اپنی ہی آواز

اور لمحہ یہ کہنا ہٹیں جیسے ——

اُگ رہے ہوں ہاتھوں پر سر بلند تیشے کچھ

خود سری کے آوازے جا بجا فضاؤں میں

بے نوائی کے سر میں خود نوائی کا سودا

خفّتِ خموشی بھی نعرۂ زباں دانی

اُس بہشت کو پہنچا اِس بہشت سے پیغام:

یہ بہشت کر لی ہے آج میں نے اپنے نام

اور زمین ایسی ہی۔ آسمان ایسا ہی
گردش زماں جو تھی صورت مکاں جو تھی!!
پیڑ یوں ہی ساکت ہیں، باد یوں ہی چلتی ہے
یوں ہی بہتے ہیں دریا یوں ہی گشت چلتی ہے
دشت و کوہ جامد ہیں بام و در بھی ساکت ہیں
اک نظام یوں ہی تھا اک نظام یوں ہی ہے
خودسری کے آوازو! کیا کوئی جواب آیا!

۳۵۰

آنکھوں کی یہ دوزخ یہ نگاہوں کا جہنم
یہ جلتے ہوئے بام و در افکار کی لو سے
یہ لحظہ بہ لحظہ مرے خوابوں کی شکستیں

ہر آن ڈرانے ہوئے پُر ہول، گرانبار
منہ کھولے ہوئے سخت و دل آزار حقائق

مضبوط، قوی، تندرو، بیساختہ وحشی
احساس ہو جیسے کسی بے حس کا۔ مگر کیوں!

ہاں سارے حقائق یہ دلِ آزار حقائق
سب میری ہی جنت کے حقائق ہیں مرے ہیں

شاید یہ اسی واسطے چبھتے ہیں نگہ میں
گھبرا کے کسی طور میں آنکھوں کو کروں بند

یہ مصلحتِ خام مگر چل نہ سکے گی
ہاں میری نظر وا ہے یہ اب وا ہی رہیگی

افکار کی گرمی سے جھلستا ہوں تو کیا ہے
ذہنوں کی گرانباری سے دبتا ہوں تو کیا ہے

۳۳۱
(۲)

کیا ہے جو دماغوں کی تپش سخت ہی مجھ پر
کیا فکر جو بے وجہ تبسم بھی گراں ہے
کانٹوں پہ دماغوں کے جو چلتا ہوں تو کیا ہے
اب بھی دلِ گم گشتہ کے تاروں پہ نظر ہے

یہ فخر سے اکڑے ہوئے ذراتِ بہشتی
یہ تمکنتِ ہست میں سرشار در و بام
پندار کے نشے میں سر اونچا کئے اشجار
یہ کج کلہی شاخ کی، غنچے کی ہُمک کی
اک زعم میں تنتا ہوا یہ سینۂ کہسار
یہ دشت و جبل، ارض نباتات و جمادات

اک بانکپن ان سب کے تکبّر سے عیاں ہے
سرشار ہیں یہ سب مری قربت کیسے نشے میں
جیسے مری قربت کی شراب آبِ وضو ہو
اور کر کے وضو محو ہوں سب حمد و ثنا میں
(جیسے یہ فرشتے ہوں مری جنّتِ نو کے)
کیا میرے فرشتے ہیں یہ میں ان کا خدا ہوں!!
خاکم بہ دہن آج یہ کیا سوچ رہا ہوں

۳۸۰

ہاں میرے تدبر کی سم آلود نظر سے
ہر موج بلا زاد نے کھائی ہیں شکستیں
ہاں چیر گئی میری نظر سینۂ ذرّات

Scanned with CamScanne

سفاک ہے ہجا بر ہے مرے ہاتھ کی گرمی
تسخیر کئے ہیں مرے ہاتھوں نے سمندر
دریاؤں کے سینے مرے قدموں کے تلے ہیں
ہاں ہیں کہ پہاڑوں کے جگر کاٹ چکا ہوں
اک پھول کا سایہ بھی ڈرا دیتا ہے مجھ کو
اک پھول کی گرمی سے ٹھٹھرتا ہوں کبھی میں
اک پھول کی ٹھنڈک میں پگھلتا ہوں کبھی میں
میں کتنا قوی، کتنا ذکی کتنا بڑا ہوں!!

۳۹۰

خود اپنے ہی ہاتھوں مجھے زہراب ملا ہے
زہراب جو میں نے انہی ہاتھوں سے پیا ہے

خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنائی ہیں صلیبیں

اور اپنے ہی قدموں سے صلیبوں پہ گیا ہوں

جس تیشے سے لایا ہوں پہاڑوں سے جوئے شیر

شوریدہ سری میں اسی تیشے سے گرا ہوں

۴۰۰ خود کو کبھی اپنے ہی شکنجوں میں کسا ہے

ٹھہرا ہوں کبھی اپنی تباہی کا سبب بھی

اور اپنی تباہی کی یہ روداد یہ نوحے

سو بار کئے ہیں رقم اپنے ہی قلم سے

دیکھا کیا کہ خدا اور کوئی اور کوئی ہے؟!

کیا جرم تھا میرا کہ نہیں میں ہی خدا بھی

یہ دشت و جبل، ارضِ نباتات و جمادات

یہ شاخیں یہ اشجار یہ مصروفِ مناجات !!

یہ حمد و ثنا زاد یہ احساس سے عاری
ہیں صرف انہی چند فرشتوں کا خدا ہوں!

ممکن ہے کہ اس کا مجھے احساس نہیں ہو
اور پیش ازل خود مری تخلیق کی صورت
اس ہستئ واحد نے کوئی کام کیا ہو
مجھ ایسے ذکی مجھ سے قوی کو کیا تخلیق
(کیا اس سے عظیم اور کوئی کام بھی ہوگا؟)
شاید اسی عظمت کے تصور نے اسے بھی
پندار خدائی کا فسوں بخش دیا ہو
ایسا ہی ہوا ہو گا یقیں آنے لگا ہے
ورنہ پھر اسے کس نے دیا حق خدائی؟؟!

اک شوق کہ کھل کر ہو گل افشانیٔ گفتار

اک لاگ کہ احساس ہی مر جائے تو اچھا ۴۲۰

جذبات کہ خاموشی کہیں جان نہ لے لے

ادراک کہ یہ لمحہ گذر جائے تو اچھا

ایمان کے ہونٹوں پہ کوئی مرثیہ جیسے:

"دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

وجدان کی آنکھوں میں کوئی زمزمہ جیسے:

دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہو

کیا مرثیہ خوانی کا سبب، ہاتھ تو دو ہیں

اک ہے تہ سنگ آمدہ جو ٹوٹ چکا ہے

اور دوسرا یہ بر سرِ سنگ آمدہ کب سے

پہلو میں پڑے تیشے کی جانب نگراں ہے ۴۳۰

اغلب ہے عجب کیا ہے جو نیشے کی مدد سے
اس سنگ گراں بار کو سونخت ہی کردے!

اُف جنتِ گم گشتہ کے یزداں کا تکلّف:-

جیسے سرِ افلاک پہ آیا ہوا سورج
آگے نہ بڑھے دن نہ ڈھلے شام نہ آئے
سرمست ہو سورج کے جلے کا پجاری
اک ماہ ہو اک سال ہو پھر ایک صدی ہو
صدیاں اس سورج کی نگاہوں میں اُتر جائیں
پھر جیسے وہ سورج کے اجالے کا پجاری
سوچے پہ نہ کر پائے عبا اپنی دریدہ
اُف جنّتِ گم گشتہ کے یزداں کا تکلّف!

سرکش بھی بہت ہیں مری جنت کے فرشتے
ممکن تھا یہاں سینکڑوں ابلیس جواں ہوں
لیکن مجھے اس کا کوئی خدشہ ہی نہیں ہے
میں خود ہی مکمل ہوں۔ بہرحال مکمل
ابلیس بھی مجھ ہی میں ہے یزداں بھی مجھی میں
اچھا ہے کہ فردوس کا یزداں ہی نہیں ہیں
اچھا ہے کہ محفوظ ہے خود ساختہ جنت
باہر کے ہر اک فتنۂ ابلیس صفت سے
لیتا ہوں میں اب اپنے گناہوں کی سزا آپ ۴۵۰

پھر کیوں ہے یہ شوریدہ سری کیسا ہے یہ کرب
جیسے مرے سانسوں کے شبستاں کا کوئی راز

جو آج میں خود سے بھی چھپانے پہ تُلا ہوں
یہ شورشِ احساس تو کر سکتی ہے خاموش
خود میری ہی آواز کی افلاک زنی کو
اس کرب سے فی الحال مفر چاہیے مجھ کو
اس شورشِ احساس کو کرنا ہے ابھی خاک
الفاظ کی ہیبت کا شر چاہیئے مجھ کو
میں اپنی ہی جنت کی خدائی میں۔ مگر قید!
یہ ماننا اب میری شریعت میں ہے ممنوع!
اب وقت ہے اس غورشِ احساس سے کہہ دوں
خود ساختہ فردوس کی یہ ساری بہاریں
یہ محو مناجات فرشتوں کی قطاریں
سب میری ہیں پھر بھی مرا تکیہ نہیں ان پر

خم ہیں سرِ تسلیم مرے آگے۔ سپر خود بھی
اب اپنی پرستش کی ادا ڈھونڈ رہا ہوں

میں اپنا خدا، اپنا خدا، اپنا خدا ہوں۔

نہیں نہیں، میں خدائے گل ہوں
نہیں کسی نے مری خدائی کی تمکنت کو
نزار و نالاں
نہیں کیا ہے
کسی نے بھی شرمسار اب تک نہیں کیا ہے
عظیم احساس داوری کو
نہیں کسی نے نہیں کیا ہے خجل
سرشت انانیت کو
مری ادائے طلسم سازی
وہ میرا پندار بے نیازی

۱۹۷۰

سبھی تنومند جیسے پہلے تھے
آج بھی ہیں
نہیں کسی کی نظر نہیں مل سکی ابھی تک مری نظر سے ۴۸۰
نہیں۔ نہیں
'آدمی'؟
یہ کرم حقیر تھا
"ننھا" ؟!
نہیں، ابھی تک۔ مری نظر میں حقیر ہے یہ

ازل کا سورج
زمیں کی تاریکیوں کو جس نے
متاعِ انوار سے نوازا

ہزار انعام نور بخشے

بس اب کوئی لمحہ جا رہا ہے
ازل کا یہ لازوال سورج
زوال کی زد پہ آ رہے گا
ہوائے مغرب کے تند جھونکے
پھر اس زمیں کی کتاب کے ہر ورق کو
پیچھے الٹ کے ہی سانس لے سکیں گے
زمین کی یہ کتاب !
جس کی ضخامتِ بیکراں کا احساس
اور کچھ سر بلندیاں دے رہا ہے
اس آدمی کے سر کو

یہ طول و عرض آج جیسے محدود ہو گیا ہے ۵۰۰

یہ وسعتیں جیسے لمحہ لمحہ سمٹ رہی ہیں

گذر کے آیا ہے روشنی کے ہزار زینوں سے

پائے آدم

بلندئ لا امکاں پہ

ایسی بلندئ لا امکاں

کہ خود قدِ آدم اس کے مقابلے میں حقیر ہے

اور جس سے یہ خود بھی ڈر رہا ہے

یہ روشنی کے ہزار زینوں کا نقطۂ ارتقاع

جو آدمی کی اب تک کی کاوشوں کا ہے

سب سے اونچا نشاں ۵۱۰

جہاں روشنی کا نقطہ

خود اپنی ہی روشنی میں گُم ہوتا جا رہا ہے
بس اب وہی لمحہ آ رہا ہے
کہ رفعتوں کا ہی پیر پھسلے
اسی بلندی کے نقطۂ ارتفاع سے
آدمی گرے اور اپنے ملبے میں دب کے رہ جائے
اس حرارت سے آپ جل جائے
روشنی کی جو کھان ہے اب
جو اس بلندی جو اس حرارت کا سب سے اونچا نشان ہے اب

۵۲۰

زمین جنت تو ہو گئی ہے
مگر ابھی اس میں اک کمی ہے
ہمارے ہاتھ اس زمیں کی تکمیل اب کریں گے

که آدمی کی ہر اک نوا سے
زمیں ہم آہنگ ہو رہی ہے
زمین کی یہ ادھوری جنت
ہر ایک شور و شرر سے محفوظ
آدمی بھی اب اسکی ساری لطافتوں کو ہزار پہلو سے دیکھتا ہے
یہی متناسب گھڑی ہے جس میں
ہم اس کا پندار چور کرنے کو
ایک سازش کریں گے
جس سے

٥٣٠

یہ سارا زعم زبان دانی
یہ سارا طوفان بدکلامی
یہ ایک جنت کے والی ہونے کا سخت پندار

سارے احساس ختم ہوں گے
اور اس طرح جذبۂ رقابت
ہمارا جذبہ
جو اَب حدِ انتقام تک آ گیا ہے۔
آسودہ ہو ہی جائے گا
ہم بہشتِ زمیں کی تکمیل کر ہی دیں گے

یہی گھڑی ہے
کہ آدمی کے قد آور اثبات کی نفی ہو
کہ اس کا سویا ہوا تکبّر بھی جاگ جائے
یہی گھڑی ہے
کہ ہم زمیں کی ادھوری جنت کو

حسن تکمیل سے نوازیں:
بلندیوں کا یہ نقطۂ ارتفاع خود
اس ادھوری جنت کا شجرِ ممنوعہ بن کے رہ جائے۔

۵۵۰

ابھی ابھی نہیں ابھرا یہ شجر ممنوعہ
وجود اس کا کہن سال ہے مری ہی طرح
مگر تلاش میں پھیلی ہوئی مری نظریں
ابھی بہشت کی اس سمت آ کے ٹھہری ہیں
جہاں ازل سے کھڑا ہے یہ شجر ممنوعہ
ابھی ابھی تو بتایا تھا میرے حاکم نے:۔
(وہ ایک فطرت یزداں جو خود مجھی میں ہے)
کہ اس کی کوکھ میں لگتا ہو یہ کالا پھل
جو خود ہی رہتا ہے محصور اپنی فطرت میں
زمین پر کبھی از خود تو گر نہیں سکتا

جو ہاتھ سے کبھی توڑا گیا یہ کالا پھل
بہشت رنگ کو کر دے گا خاک کا تودہ ۵۶۰
قریب گوش نظر دل کے ہونٹ ہلتے ہیں
کہ یہ زمین کی جنت کہ یہ بہشت کبیر
خدائے عرش کی آنکھوں میں بھی کھٹکتی ہے
دگرنہ اس کو خدائیت کے نشے ہیں
مجھی کو بار خجالت سے زیر کرنا تھا
(پھر ایک بار جو کیرناس تھا راندۂ جنت)
تو اس کے واسطے کافی تھا شجر ممنوعہ
مگر بہشت زمیں کا یہ شجر ممنوعہ
کہ خود بہشت کی تخریب کا سبب بن جائے
یہ سرخ پھول تو ممنوعہ ہو نہیں سکتے ۵۷۰

که سُرخ پھول تو آتے ہیں میرے ہاتھوں ہیں
ہر ایک شاخ سے بیساختہ ہزاروں بار.

ابھی ابھی تو انہیں سُرخ سُرخ پھولوں نے
زمین کی جنت نوزائیدہ کے پیکر کو
نیا جمال نئے رنگ کی جلا دی ہے
ہر ایک سمت نئی روشنی بہا دی ہے۔

دبا ہے زور نیا میرے دست و بازو کو
نیا غرور دیا ہے مری اداؤں کو
یہ سرخ پھول تو ممنوعہ ہو نہیں سکتے

٥٨٠

لو جاگ اٹھا وہ تلوّن —— مری بلیغ ادا
جو ایک جنت خاموش چھوڑ آئی تھی

شجر کے سائے میں کالے پھلوں سے ملنے کو
تلاش و شوق میں وہ اُٹھ رہا ہے میرا ہاتھ
کہ دیکھ دیکھ کے زہریلے سانپ کے تن پر
حسین دھاریاں کچھ دلفریب رنگوں کی
ہمک ہمک کے اٹھے کوئی طفلک ناداں
اور اشتیاق میں بڑھ جائے سانپ کی جانب

اِدھر بہشت بدر ہونا میری قسمت ہے
نئی زمیں نئی دنیا اُدھر مراجع ہے
مجھے بہشت تو ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ
مری بہشت میں ہونا ہے شجرِ ممنوعہ
شجر کھڑا ہے یہ جنت ہے، اور مَیں زندہ ہوں

۵۹۰

مگر نگاہ تو ساکت ہے اک زمانے سے
شرار ہے کہ نگاہوں سے لے رہا ہے خراج
طلسم ہے کہ دماغوں کا خون کرتا ہے
وہی بہشت وہی ہیں بہشت کے منظر
نہ جانے کتنے زمانوں کا خون چوسے ہوئے
نظر جو اب بھی نہ اکتائے تو نظر کیا ہے

لو پھر کھلا وہ تلوّن وہی بلیغ ادا

یہ روشنی کا محل منزلِ فقط ہی نہیں
یہاں نگاہ جو پتھرا گئی تو کیا ہوگا
کہ اب نگاہ میں اک درد جمتا جاتا ہے

نجات صرف اسی طور اب تو ممکن ہے
کہ اس جمود کو توڑوں میں کال لے پھل کے ساتھ
کہ روشنی کا محل ہی تباہ کر ڈالوں
نظر کے سامنے آجائے پھر نئی دنیا
اسی طرح اب اس آزار سے مفر مل جائے
بہشت زیر و زبر ہو تو اپنا گھر مل جائے
یہ ٹھیک ہے کہ نگاہیں وہاں بھی رک نہ سکیں
وہاں بھی اپنے ہی گھر کی تلاش باقی ہو
مگر نگاہ کے آگے سے اب تو ہٹ جائے
بہشت زاد نظاروں کا خوشنما یہ حجاب
یہ تیرگی کی نوازش یہ روشنی کا عتاب
پھر ایک بار جو ہو جاؤں راندۂ فردوس

۶۱۰

تو اس نگاہ کو جیسے اک آس مل جائے
کہ پھر اسی طرح شاید کوئی زمیں مل جائے
اگرچہ وہ بھی کبھی اک بہشت بن جائے
مگر نگاہ کو فی الحال اک سکوں تو ملے
کہ اب تو درد کی میراث ختم ہو جائے
نظارگی تو بہت ہو چکی ہے رنگوں کی
نظر کو اب کسی نادیدگی کی دید سہی
وہ اس بہشت کی تخریب کے دھماکے ہوں
کہ اُس زمین کی ناداریوں کے ویرانے
کسی بھی طور کوئی شکل مختلف تو ملے !

خیال گاہ مقدس ہیں

نوید تھی کہ طلسمِ کہن بس اب ٹوٹا

بس ایک لغزشِ پائے حیات

بس ایک جنبشِ دستِ گناہ

پہنچ رہا ہے جو کالے پھلوں کے پاس

پھر اس کے بعد

نیا جنون نئی راہ

نئی زمیں — نئی دنیا

اُٹھے ہوئے ہیں ابھی ہاتھ

پہنچ رہے ہیں جو کالے پھلوں کے پاس

۶۳۰

خیال گاہ میں اک شور سر اٹھاتا ہے
خیال گاہ مقدس میں !

یہ ایک چھوٹا خیال
یہ ایک خدشۂ ناپاک و ناخلف
کہاں سے آیا یہ منحوس وسوسہ
کہ اس سجی ہوئی جنت کے خون سے آگے ۶۴۰

وہاں — ادھر —
کسی نشے کا اگر
نشاں ملا ہی نہیں
نئی زمیں نئی دنیا اگر ملی ہی نہیں ! ۶۴۴
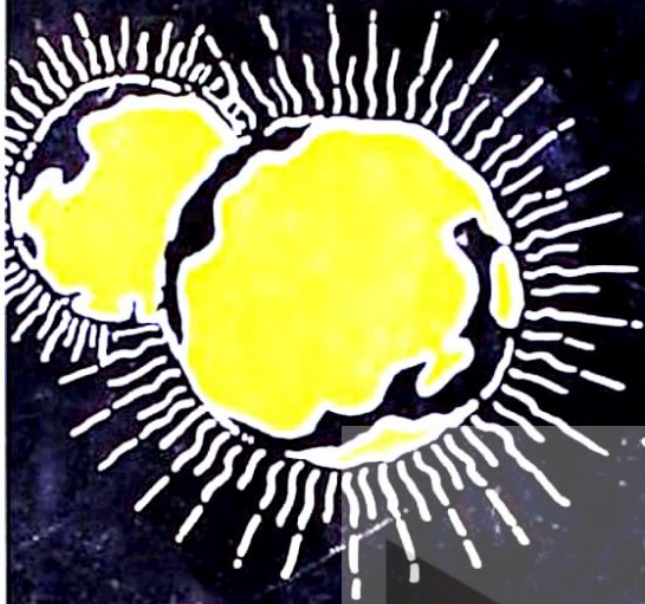
○ ○ ○

مصرعِ ثانی
شجاع خاور
دل جل رہا ہے تو یہاں آہ و فغاں طلب کرو

مصرعِ ثانی

شجاع خاور

سالِ اشاعت : ۱۹۸۷ء (فروری)
کتابت : جمال گیاوی
سرورق : قیس رامپوری
ترتیب واہتمام : سراج درپن
طباعت : نعمانی آفسیٹ پریس، ترکمان گیٹ، دہلی
تعداد : ایک ہزار
قیمت : ۵۰ پچاس روپے

ناشر : غزل آباد
(کلچرل سوسائٹی) لال کنواں، دلی

واحد تقسیم کار :
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ دریا گنج
نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

MISRA-E-SAANI (POETRY) BY SHUJA KHAWAR PRICE 50.00

اِنتساب

تمہارے نام

نام : شُجاع الدّین (سَاجِد)

ولدیت : اَمیر حَسَن

قلمی نام : شُجاع خاور

تاریخِ پیدائش : ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء

آغازِ شعر : ۱۹۶۴ء

درسی تعلیم : ایم اے (انگریزی ادب)

مکاتب : مَظہرُ الاِسلام، مِڈل اِسکول، فراشخانہ، دہلی
اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اِسکول، اَجمیری گیٹ، دہلی
دِلی کالج (دہلی یونیورسیٹی) اَجمیری گیٹ، دہلی
شُعبۂ انگریزی، آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسیٹی

پیشہ : سَرکاری مُلازمت

نیا پتہ : فلیٹ ۳، ٹائپ فائیو فلیٹس
نزد تھانہ دریا گنج، نئی دہلی

پُرانے پتے : مکان ۱۰۰۷، گلی راجان، بازار فراشخانہ، دہلی

مکان ۱۷۲۲، محلہ رودگران،
بازار لال کنواں، دہلی

مطبوعات

ماضی قریب میں :

"واوین" شعری مجموعہ (غزلیں اور نظمیں) سنہ ۱۹۸۲ء

ماضی بعید میں :

"دوسرا شجر" (طویل نظم) سنہ ۱۹۷۰ء

"اردو شاعری میں تاج محل"
(ترتیب و تالیف) سنہ ۱۹۶۸ء

Scanned with CamScanner

ہم نے غزل میں اس کے سوا سب سے بات کی
اب اس کو آپ کچھ بھی کہیں اصطلاح میں

ترتیب

غزلیات

شعریت کے نام پر غفلت سے ہوئے بیزار لوگ
میرے شعروں پر بھی سر دھننے لگے دو چار لوگ
الحمد لائبریری
کتابیں
پڑھیے
Imagitor

عصرِ اولیٰ

ظ۔ انصاری

شروع کا صفحہ الٹیں گے تو آپ ایک چنچل اور چنبل اور "بے محابا" شاعر سے ملیں گے۔ کلام کی مقدار کم ہے ورنہ مَیں اسے "بے تحاشا" لکھتا اور یہ کوئی لفاظی یا پھبتی نہ ہوتی۔ شُجَاع خَاوَر غالباً قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور بیان کے ترچھے، البیلے چوکا دینے والے اور بعض اوقات کچوکے دینے والے انداز سے یوں دادِ شجاعت دیتے ہیں گویا شعری مردانگی کے ہاتھوں وہ ہر ہفتے ایک دیوان یا دیوان زادہ خلقِ خُدا کے حوالے کر دیں گے۔ مگر جب آگے بڑھیے، دوبارہ سہ بارہ پڑھیے تو کھلتا ہے کہ اس نسبتاً کم عمر میں جہاں دیدہ لوگوں جیسی تجربے کی زنگارنگی اور گہرائی، ڈیرہ دار استادوں کی سی مشاقی، کھلنڈرے نوجوانوں کی سی بے باکی اور ایک قلندر کی "بر پاپوشِ قلندر" والی بے نیازی ان کی شخصیت میں ایسی رچی بسی ہے کہ اکثر شعر ان پر وارد ہوتا ہے اور ان سے صادر ہوتا ہے۔ ان کا کام تخیل کی پرواز کو

لفظوں کے کنٹرول میں لاتے وقت بس اتنا ہی رہ جاتا ہے جتنا خلاباز کا، خلائی پرواز کے وقت، کہ یہاں وہاں کوئی ڈھبری کس دی۔ "رِموٹ کنٹرول" سے پیغام وصول کر لیا۔ کمپیوٹر کا کوئی بٹن دبا دیا اور کانوں پر سے ہیڈ فون اتار کر ذرا ہنس بول لیے۔

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ کاموں اور مصروفیتوں کے ہجوم میں رہ کر کاغذ کے پرزوں، پرچیوں پر کوئی ردیف کوئی قافیہ کوئی ناہموار سی زمین نوٹ کر لیتے ہیں ـــــ اور جب اس ورق کو پھر کھولتے ہیں تو پوری غزل کاغذ پر اُترتی چلی آتی ہے لیکن ان کے مشاہدوں اور تجربوں کے البم میں اتنی زنگارنگی ہے ان کی روح میں اس قدر بے قراری بھری ہے، الفاظ اور تراکیب عادی مجرموں کی طرح دست بستہ یوں ان کے حضور کھڑے رہتے ہیں کہ بے اختیار ان کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے اور وہ جیسے اور جس قدر چاہتے ہیں لفظوں میں بند کر دیتے ہیں اور کبھی تو قلم کو بھرے ریوالور کی طرح داغتے چلے جاتے ہیں۔ چند تجربے اور ان کے نقوش کو تو انھوں نے اتنی بار نشانہ بنایا ہے کہ چھلنی کر ڈالا ہے۔ مثلاً رقیب کی چالبازی، دوست نما دشمن کی حرمزدگی ریاکاری کے خوشنما پیکروں کی دلفریبی، ٹکسالی اداروں کی آبرومندی۔

آج تک ہم نے ان کی صورت نہیں دیکھی، آواز بھی سنی تو فون پر سُنی۔ کلام دیکھا تو اِدھر اُدھر، کبھی کبھار، مگر جب پہلی بار آج سے کوئی پندرہ بیس برس پہلے چند نظمیں غزلیں پڑھی تھیں تو چونک اٹھے تھے کہ اگر اس نونہال کو بھیڑیے نہ اُٹھالے گئے تو ایسا رنگ روپ نکالے گا، ایسے ٹھہا کے دار قہقہے مارے گا، ایسا جیتا جاگتا طنز یہ ترنم پھیلائے گا جو کسی خاص دور اور کسی ترقی یافتہ زبان کی تندرستی کی علامت ہوا کرتا ہے اور جس علامت یا آثار سے آج کل کی ہماری اُردو شاعری محروم چل رہی ہے۔

○

شاعری کبھی بات کا پردہ ہوتی ہے کبھی حالات کی پردہ دَری ـــــ
شجاع خاورؔ اپنے کلام میں (۱۰۰ سے اوپر غزلوں کے اس مجموعہ میں اس سے پہلے

"واوین" میں اور اس سے بھی پہلے نظم و نثر کی تحریروں میں) ۔ بالارادہ اور بلاارادہ خود کو اس قدر ظاہر کر چکے ہیں کہ انھیں ذاتی طور سے جانے بغیر بھی موٹے لفظوں میں بایوگرافی مرتب کی جا سکتی ہے ۔ یوں سامنے سے دیکھو تو لفظوں کا مزا ہے، قافیوں کی پٹک ہے ، ردیفوں کی چٹکیاں اور چہلیں ہیں، لیکن اچانک آپ ٹھٹکتے ہیں اور سوچ میں پڑتے ہیں کہ بظاہر سامنے کی بات اتنی سامنے کی بھی نہیں ہے، اس تجربے سے آپ گزرے ہیں، عملی ورنہ خیالی زندگی میں ـــــ یا کسی اور کے افسانے میں سُن یا پڑھ چکے ہیں ، فوراً کوئی شعر یا مصرعہ پھانس کی طرح یادداشت میں کھٹکنے لگتا ہے اور بے خیالی میں پڑھا ہوا شعر پلٹ کر پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔ دو ایک مثالیں :

ذہن کو حالانکہ پختہ کر دیا ہے تجربوں نے
با وجود اس کے مری آنکھوں کی حیرانی وہی ہے

○

بازار میں ہر شخص قصیدے کا طلب گار
ہم ہیں کہ لیے پھرتے ہیں اشعار غزل کے

○

جیسا منظر ملے گوارا کر
تبصرے چھوڑ دے ، نظارا کر
وصل کس کو نصیب ہوتا ہے
داغ کے شعر پہ گزارا کر

○

ڈوبنے سے فائدہ بھی ہوگا اور نقصان بھی
ذہن سے طوفان، ہاتھوں سے کنارہ جائے گا

○

بظاہر یہ سپاٹ کلامِ موزوں ہے لیکن وہ آنکھیں جن کی حیرانی تجربوں کی پختگی سے پگھل کر بہہ نہیں گئی ——— وہ آنکھیں ان اشعار کی سادگی پر اور تہہ داری پر حیران ہوں گی ان میں زندگی کے ساتھ بچوں کا سا معصومانہ برتاؤ اور جوانوں کا سا عملی حوصلہ نظر آئے گا ——— "گوارا کر" مجموعے کے ہر ورق سے اس بیان کی تصدیق ہو گی۔

○

کیا شجاع خاور لمحۂ حاضر کا شاعر ہے؟ ماضی سے بے زار، مستقبل سے بے پروا؟ کیا شجاع خاور ایک ایسے خوش باش نوجوان کا روپ دھارے رہتا ہے جسے ہر وقت مصاحب اور ہم نشیں میسر ہیں؟ جب دیکھو وہ اس طرح زبان کھولتا ہے جیسے سامنے والے سے کچھ کہنا ہے۔ کوئی تبصرہ، کوئی حاشیہ، کوئی ریمارک اہلِ محفل کو یا مشتاق سننے والے کو جتانا ہے؟ ——— کیا شجاع خاور لفظوں اور استعاروں، علامتوں اور محاوروں پر اپنی گرفت یا چابک دستی دکھانے اور منوانے کی خاطر بعض شعر نکالتا ہے؟ کیا اس نے غزل کی بعض ایسی زمینیں خصوصیت سے چنی ہیں جن میں اگلے "مرزبان" ہل نہیں چلا گئے؟ مثلاً

اب تہر بھی میرے خدا کا دیکھیے
بس ہونے والا ہے دھماکا دیکھیے

○

کیسے تنہائی کے ہاتھوں لُٹ گیا انسان، دیکھو
آؤ میری چارپائی کا شکستہ بان دیکھو

○

صحیح بات تو یہ ہے کہ تم غلط نہ ہم غلط
غزل کے شعر کہہ کے یوں ہی کر رہے ہیں غم غلط

رکھتے ہیں اپنے خوابوں کو اب تک عزیز ہم
حالانکہ اس میں ہو گئے دل کے مریض ہم
اس کے بیان سے ہوئے ہر دل عزیز ہم
غم کو سمجھ رہے تھے چھپانے کی چیز ہم

○

دشت گردی کا ارادہ کر لیا ہے
ہم نے اک گھر شہر کے اندر لیا ہے
اپنے ذمے کار دُنیا ہم نہ لیتے
یہ تو تجھ سے چھوٹ جانے پر لیا ہے

کیا شُجَاع خَاور کسی غزل میں بھی اپنے اندر گم نہیں ہونے پاتا؟ اپنے گرد و پیش سے بے خبر، اصل موضوع یا خیال میں گمُ، اوروں کے وجود اور ان کے ری ایکشن سے بے خبر ——— گم شدہ؟ ——— کبھی نہیں! جب دیکھو کسی نہ کسی سے بات ہو رہی ہے۔ بے تکلفی برتی جا رہی ہے۔ ارے میاں (اماں)، بھائیُ۔ دوستو، میاں، ارے صاحب۔ قسم کے خطابیہ الفاظ جو یقیناً بھرتی کے نہیں ہوتے (جیسے چارپائی کی چول میں پچّر ٹھونک دیتے ہیں) ——— جہاں وہ آتے ہیں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ انھیں یہیں ہونا چاہیے تھا:

موضوع بھی یوں کون سا اچھا ہے ہمارا
اور اس پہ یہ انداز، اماں کون سُنے گا

○

کون آپ کی باتوں میں آئے گا شُجَاع صاحب
اشعار سے کیا دنیا بدلے گی، اماں چھوڑو

یہ اور ایسے ہی چند سوال اس مجموعے کی ورق گردانی کرتے وقت ابھرتے ہیں اور صاف کہوں کہ خود یہ کلام ان سوالات کے اُٹھانے کا ذمّہ دار ہے، اسی لیے تائید بھی ہو جاتی ہے —— مگر یہ معاملے کا ایک پہلو ہوا، معاملے کا دوسرا پہلو اسی "چھوڑو" والی سادہ سی بے تکلف سی غزل میں یوں اُبھرتا ہے:

تاریخ کی خاطر بھی دو ایک نشاں چھوڑو
اندر ہی جلو لیکن باہر تو دھواں چھوڑو
کہتے ہیں کہ تب آنا جب آہ و فغاں چھوڑو
اُس بزم میں جاؤ تو اس دل کو کہاں چھوڑو
ہر بات کہو کھل کر ذو معنی زباں چھوڑو
یا کعبے سے منہ پھیرو یا کوئے بتاں چھوڑو
اظہار کی خوبی کا اُس پر نہ اثر ہوگا
جلنے کا سبب ڈھونڈو، فرقت کا بیاں چھوڑو

یہ اس شاعر کا نمائندہ رنگ ہے۔ اوپر سے دیکھو تو خواہ مخواہ —— اندر جھانکو تو ایک جہاں دیدہ، مردم گزیدہ، اور سرد و گرم چشیدہ شخص کے "ملفوظات" کا مزہ پاؤ۔ ہر غزل میں چٹخارہ زبان و محاورے کا ویسا نہیں جیسے دہلی اسکول کے شاہ نصیر و شیخ ابراہیم ذوق کے ہاں تھا نہ ویسا جو داغ اسکول کی پہچان ہے، ویسا بھی نہیں جیسا بعض جدید غزل گویوں، اور غزل گروں نے چند گنی چنی علامتوں کو نچوڑ کر، اجنبی اور تازہ ولایت اصطلاحیں بگھار کر ڈالا تھا اور اشتہار کر دیا تھا کہ جدید غزل نے غزل میں روحِ تازہ ڈال کر اس کی آبرو رکھ لی ہے، یہ اگلوں سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ ان نئوں سے اوپر غزلوں میں وہ سارے مسالے بھی پڑے ضرور ہیں۔ ریت۔ پتھر، صحرا، کنکر، روٹی، شعور، شہر، اجنبی، سبھی کچھ ہے۔ قافیہ بندی بھی کہیں کہیں تو کمال کی ہے جس کی داد "لکیر پیٹا کر" والے شاہ نصیر بھی دیتے لیکن ایک

صفت جو اس کلام کو بیک وقت کلاسیکی، موڈرن اور انفرادی بناتی ہے ـــــــ وہ ہے شاعر کا شاعرانہ خلوص، جسے فن کارانہ صداقت بھی کہہ سکتے ہیں۔ شجاع خاور کو اُردو کے کلاسیکی سرمائے پر خوب عبور ہے، وہ اگلوں کے لہجے میں بات کرنے کو نہ نقالی سمجھتا ہے نہ اس سے شرماتا ہے، وہ عہدِ حاضر کے رنگِ سخن سے اور ٹھوس بات کو ٹھوس لفظوں میں کہنے سے نہ جھجکتا ہے نہ اِسی کو اپنی شناخت بناتا ہے، نہ وہ نثری جملوں کی موزونیت کو شعر سے کاٹ کر نکالتا ہے اور نہ لفظوں کی ذات برادری پوچھتا ہے۔ قدرتِ کلام اور ذہنی مشاقی اس کلام کی مقدار سے نہیں اس صفت سے ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں کوئی استعارہ یا اظہار جبّہ و دستار پہنے بڑے تکلف سے جلوہ افروز ہے، وہیں ایک جاٹ اپنا پگڑ جمائے بیٹھا ہے ـــــــ اور دونوں پہلو بہ پہلو ہیں۔ اور دونوں کی یکجائی شاعر کی فن کاری میں سرکشی کو اُبھار کر دکھاتی ہے، یہ جدت بھی ہے ندرت بھی ہے، شاعر کی شناخت بھی ہے اور اس کے شاعرانہ حوصلے کا کارنامہ بھی جو رائگاں نہیں جائے گا۔ اپنے ماننے والے پیدا کر کے رہے گا۔ دو ایک مثالیں :

پار اُترنے کے لیے تو خیر بالکل چاہیے
بیچ دریا ڈوبنا بھی ہو تو اک پل چاہیے

شخصیت میں اپنی وہ پہلی سی گہرائی نہیں
پھر تری جانب سے تھوڑا سا تغافل چاہیے

جن کو قدرت ہے تخیّل پر انھیں دکھتا نہیں
جن کی آنکھیں ٹھیک ہیں ان کو تخیّل چاہیے

○

نقاد تم کو پوچھتے آئے تھے کل شجاع
کہتے تھے شاعروں میں تمھارا بھی نام ہے

شاعری میں گفتگو کے لفظ ہم لائے، مگر
پھول جو اصلی تھے مصنوعی لگے گلدان میں

آپ کا انداز رہنا چاہیئے تھا آپ تک
غیر بھی کرتا ہے گستاخی ہماری شان میں

شدتِ تنہائی کی تاریخ گویا دفن ہے
میری تنہا چارپائی کے شکستہ بان میں

شجاع خاور جیسے ہمہ وقت واحد متکلم کی زبان سے بار بار تنہائی کا لفظ اوّل اوّل کھٹکتا ہے آخر آخر لو کی طرح معنی دینے لگتا ہے ـــــــ اس پر دھیان جاتا ہے۔ یہاں وہ اس طرح سے نہیں جیسے ریاض خیرآبادی جیسے ہوش مند اور پارسا کے کلام میں خمریات کا چرچا۔ بلکہ اس کے پس پردہ کہیں تنہائی کا درد، تنہائی کی لذت اور تنہائی کا خوف ملا جلا ہے۔ یہ صرف جسمانی تنہائی یا ایک جلوت پسند کی خلوت نہیں بلکہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہے ـــــــ ذہنی خلوت، عالمِ بے رفاقت، پانچ غزلیں تو مسلسل "تنہائی" کی ردیف کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ایک بار میں شاعر کی تسکین نہیں ہوئی وہ اس لفظ سے ذاتی برتاؤ جتانا چاہتا ہے، پہلو بدل بدل کر اپنے سننے پڑھنے والے کو اس کیفیتِ تنہائی کے مختلف پہلوؤں سے باخبر کرنا چاہتا ہے۔ تبھی تو کہتا ہے:

شجاع اس کو سمجھتے ہیں آپ ہی، ورنہ
کسے نصیب نہیں ہے جنابِ تنہائی!

اور بولی کے موٹے روزمرہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

جہاں پہ سلسلہ بنتا ہے کچھ رفاقت کا
نکالتی ہے وہیں آر جار تنہائی

اور یہ نکتہ :

عذابِ جاں بھی جہاں میں نہیں کوئی ایسا
رفیق بھی ہے بڑی بے مثال تنہائی

اگرچہ شہر میں بکھری ہے جا بجا، پھر بھی
شجاع اپنے لیے گھر میں پال تنہائی

○

میاں شجاع یہ خاموشی تھوڑی دیر کی ہے
ابھی سنائے گی قصے پچاس تنہائی

○

عقب میں اس کے خیالوں کا قافلہ ہے شجاع
ہجومِ غم کی ہے گویا نقیب تنہائی

شجاع خاور کے اس کلام میں ہم اس فن کار سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں جو ہمہ وقت" واحد متکلم" رہنے کے باوجود اندر سے بڑا تنہا ہے اور جس نے تنہائی کی نوحہ گری نہیں کی، اسے پال لیا، اپنا لیا، اس سے کام لیا، ادب اور فلسفے کی کتابوں نے جو شعور بخشا ہو گا اُسے ذاتی غور و فکر کی بھٹی میں ڈالا اور اس سے ایک لہجہ ڈھالا۔ وہ لہجہ جو دہلی کے لال کنوئیں کے کرخندار سے جے، این، یو کے سیمی نار تک بل کھاتا لہراتا چلا گیا ہے۔ کوئی شخص جسے لفظ و معنی پر ماہرانہ قابو نہ ہو جس نے اصولوں اور فارمولوں کو اپنے طور پر جانچا

پر رکھا نہ ہو اور جسے پھکڑ پن کی پھبتی سننے سے عار آتا ہو وہ یہ شاعرانہ جرأت نہیں کرے گا جو "مصرعۂ ثانی" میں ہر ایک صفحے پر بکھری ہوئی ہے —— یہ شاعر آمد و آورد، فن کاری اور استادی، غزل اور ہزل، مصنوعی تکلفات کے پوز، خودسازی کے آداب اور بے تکلفانہ جملہ بازی کا فرق خوب سمجھتا ہے مگر اس نے بے تکلفی کی بات چیت کو، جو مصرعوں کے بجائے نثری جملوں کی ساخت رکھتی ہے خاص اس غرض سے اختیار کیا ہو گا کہ اظہار کا حسن میکس فیکٹر کی مہربانی سے آزاد رہے، اس نے پھکڑ، کلڑ جیسے قافیے اور الفاظ ادبی ذوق رکھنے والوں کو چونکانے کے لیے نہیں، مہذب محفلوں کے چٹکی بھرنے کے لیے اور سستی شہرت کمانے کی خاطر نہیں اپنائے بلکہ کچھ تو اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں اور بیشتر اس نیت سے یہ لب و لہجہ اور انتخابِ الفاظ اختیار کیا ہے کہ جب وہ "زہد ریائی" یا اپنا امیج بنانے اور جھنڈے پر چڑھنے اور چڑھانے والوں کی پگڑی اچھالے، ان پر پھبتی کسے تو یہ بنے ہوئے لوگ اُسے ایک پھکڑ کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیں وہ تو شاعر سے ظاہرا درگزر کریں مگر اس کا پھکڑ پن ان پر چپک جائے، جان کا لاگو ہو جائے :

قلم نے خوب غزل گوئی کی شجاعؔ مگر
غزل سرائی نہیں کر سکا گلا میرا

○

کب تلک خود ہی نکالو گے شجاعؔ اچھی زمینیں
ایک دن تم بھی کسی استاد کا دیوان دیکھو

○

شعر پر تو آپ کی قدرت مسلم ہے شجاعؔ
اس زمانے کا بھی کچھ اچھا بُرا معلوم ہے؟

○

صرف تھوڑی سی سخن فہمی اگر دے دے خُدا
زندگی کا لطف غالبؔ کی طرفداری میں ہے

نام جس کا پڑ گیا ہے خواب کی بستی شجاع
وہ علاقہ آج کل اپنی عملداری میں ہے

○

چرچا حقیقتوں کا بہت ہو چکا شجاع
گلفام اور پری کی کہانی سنائیے

لیکن شجاع خاور کے کلام میں کہیں بھی گلفام اور پری کی کہانی نہیں ہے نہ وہ اس کام کے آدمی ہیں۔ البتہ ایسی کہانی سنانے کے لیے پریوں کے جس دیس میں آمد و رفت ضروری ہے وہ انھوں نے ضرور رکھی ہوگی اور جیسی لوچ دار، نمکین، چٹپٹی زبان درکار ہے وہ ان کے پاس وافر مقدار میں ہے اور اس کا زبردست اسٹاک ہے۔ ان کے تازہ پیشے کی مصروفیات اور ماحول نے بھی ان سے بعض اشعار کہلوائے ہیں (جو ہماری رائے میں قابلِ تعریف ہے) وہ شعر میں گفتگو کی اور عام سے محاورے میں فلسفے کی جوٹ ملا دیتے ہیں —— وہ خاص ابھی کا صدری نسخہ ہے اب تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا مگر وہ شے جو خود شجاع خاور کے ہاتھ نہیں لگی، وہ استادی گر آسانی سے نصیب نہیں ہوتا۔ شجاع خاور جیسی قدرتِ کلام کا شاعر جب موج میں ہو اور الفاظ و استعارات کے گھوڑے پر چڑھے تو بعض اوقات وہ راکب نہیں مرکب ہو جاتا ہے۔ باگ پر ہاتھ اور رکاب میں پاؤں شاعر کا نہیں، اس کی سواری کا ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کو یہ طرفہ تماشا بھی خوب لطف دیتا ہے:

آب ہو وہ آئی جو بہک کر بہ عدو کے بعد وصل
اور پانی ہو وہ جو میری آرزوؤں پر پھرا

ویسے تو ہر غزل میں ایک دو ایسے شعر ضرور ملیں گے جو خاص اس شاعر کی ترجمانی یا نمائندگی کرنے والے ہوں لیکن بعض غزلیں کی غزلیں شجاع خاور کے رنگِ سخن میں رنگی ہوئی اور اپنے

اسی عہد کی، اس کے شعری تجربے کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ پوری غزل جس کا مطلع ہے:

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے
پکارنے کے لیے اک خدا ضروری ہے

اور مقطع تو بس وہی کہہ سکتے تھے:

شجاعؔ موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا، بڑا ضروری ہے

ان کے بزرگوں اور معاصرین میں کسی نے یہ باتیں اس ڈھب سے نہیں کہی تھیں، خیر آئندہ کہی جائیں گی۔

بمبئی
۱۷ر دسمبر ۱۹۸۶ء

——— ظ۔ انصاری

الحمد لائبریری
فیس بک گروپ۔ کتابیں پڑھیے

الحمد لائبریری

اظہار میں تو شکوہ ہی بن جائے گا موضوع
سو طاہر نہیں پڑتا ہے ہر بات پہ رونا
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ۔ کتابیں پڑھیں
سید حسین احسن
Imagitor
Imagitor

الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ۔
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

غزلیات

سنائے وصل کی شب ہر کس و ناکس کے شعر اُس کو
اور اب فرقت میں اپنا شعر بھی اچھا نہیں لگتا
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن
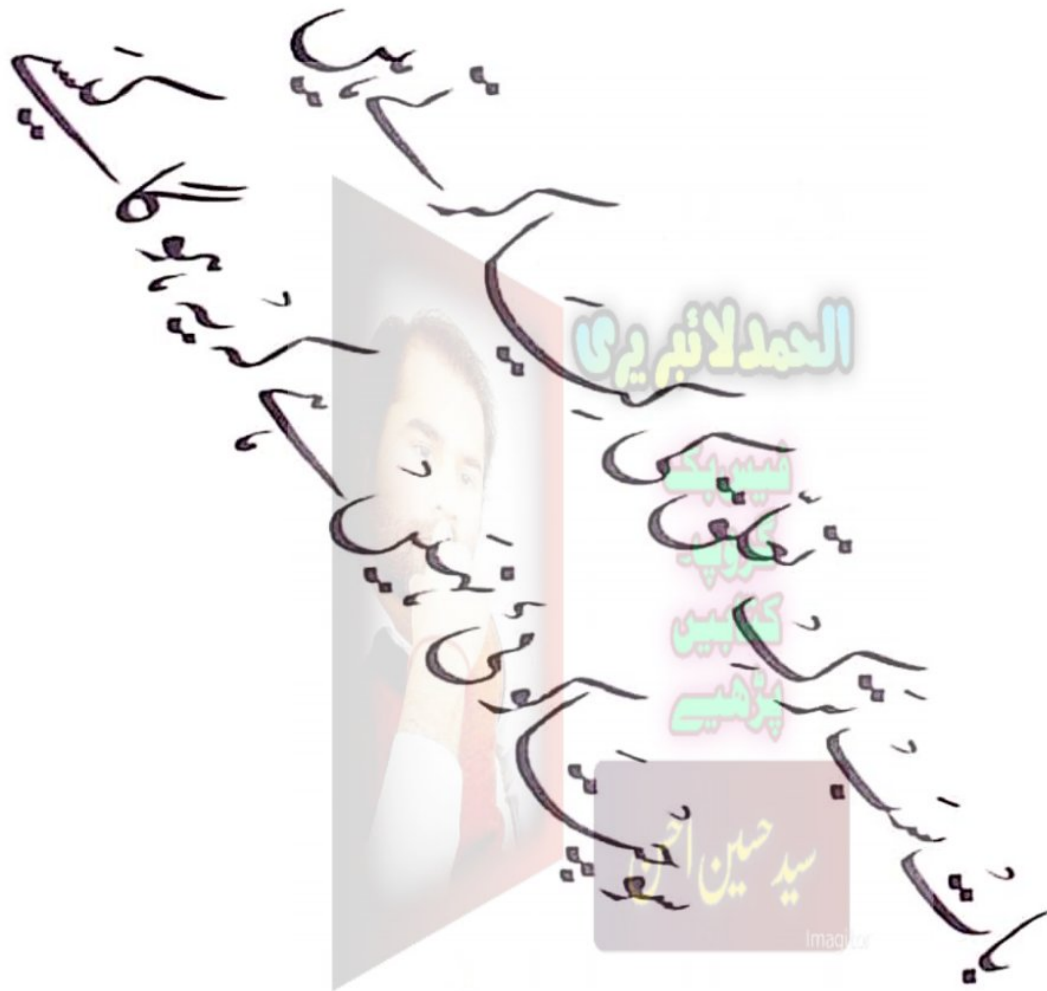
ضبطِ تشا ہل ایک تو ویسے بھی عیاری میں ہے
پھر مزا بھی وہ نہیں جو گریہ و زاری میں ہے

کام مِل جائے تو پھر خالی نظر آئیں گے ہم
جو بھی کچھ مصروفیت ہے صرف بیکاری میں ہے

صرف تھوڑی سی سخن فہمی اگر دے دے خدا
زندگی کا لطف غالب کی طرفداری میں ہے

نام جس کا پڑ گیا ہے خواب کی بستی شجاع
وہ علاقہ آج کل اپنی عملداری میں ہے!

دُوسری باتوں میں ہم کو ہو گیا گھاٹا بہت
وَرنہ فکرِ شعر کو دو وَقت کا آٹا بہت

کائنات اور ذات میں کچھ چل رہی ہے آجکل
جَب سے اَندر شور ہے باہر ہے سنّاٹا بہت

آرزو کا شور برپا ہجر کی راتوں میں تھا
وَصل کی شب تو ہوا جاتا ہے سنّاٹا بہت

دل کی باتیں دُوسروں سے مت کہو، لُٹ جاؤ گے
آج کل اظہار کے دھندے میں ہے گھاٹا بہت

میرا دل ہاتھوں میں لو تو کیا تمھارا جائے گا
اور میرا ہی سمرقند و بخارا جائے گا

تشنگی کا ایک اک پہلو ابھارا جائے گا
وصل کی شب کو بھی فرقت میں گزارا جائے گا

کل یہ منصوبہ بنایا ہم نے پی لینے کے بعد
آسمانوں کو زمینوں پر اتارا جائے گا

دوست سمجھاتے تو ہیں لیکن سمجھتے یہ نہیں
جو بھی کچھ جیسے بھی جائے گا، ہمارا جائے گا

ڈوبنے سے فائدہ بھی ہوگا اور نقصان بھی !
ذہن سے طوفان ہاتھوں سے کنارا جائے گا

ڈر د جائے گا تو کچھ کچھ جائے گا، پر دیکھنا
چین جب جائے گا تو سارا کا سارا جائے گا

کچھ نہیں بولا تو مر جائے گا اندر سے شجاع
اور اگر بولا تو پھر باہر سے مارا جائے گا

○

ہو گئے تہذیب کے آگے بڑے لاچار لوگ
شرحِ غم کرتے نہیں ہیں اب سرِ بازار لوگ

رات آجائے تو پا لیں خواب کا آزار لوگ
رفتہ رفتہ کام سے لگ جائیں پھر بیکار لوگ

شعریت کے خوابِ غفلت سے ہوئے بیدار لوگ
میرے شعروں پر بھی سر دھننے لگے دو چار لوگ

بزم آرائی کی کوئی بات بھی کرتا نہیں
ظلمِ تنہائی کا سہتے جا رہے ہیں یار لوگ

دشت کی جانب بھی اب جائیں تو کچھ حاصل نہیں
اب تو اپنے آپ سے بھی ہو گئے بیزار لوگ!

مصرعِ ثانی

پہلے مرنے پر بھی آمادہ رہا کرتے تھے سب
اور اب جینے کو بھی ہوتے نہیں تیار لوگ

عطر و عنبر کے خریداروں کی مشکل ہو گئی
نانِ گندم بیچتے ہیں آج کل عطار لوگ

آرزو کے شہر کی آب و ہوا اچھی نہیں
دیکھتے ہی دیکھتے پڑنے لگے بیمار لوگ
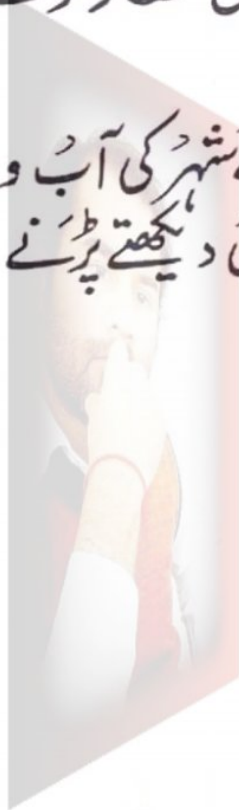
آپڑا ہُوں نا اُمیدی کے کُھلے مَیدان میں
کوئی گھر خالی نہیں ہے کوچۂ امکان میں

عام انساں کیا مُفکّر بھی رہے نُقصان میں
بام و دَر کیا فلسفے بھی اُڑ گئے طوفان میں

ہم سمجھتے تھے فقط ہم ہی ہیں اس بُحران میں
دیکھ کر بے جان سب کو جان آئی جان میں

ہے مُقدّس تر شبِ وعدہ سے روزِ انتظار
سچّے روزے دار کی تو عید ہے رمضان میں

اپنی غُربت کا بھی زیادہ تذکرہ اچھا نہیں
فارسی خُود اجنبی لگتی ہو جب ایران میں

شاعری میں گفتگو کے لفظ ہم لائے، مگر
پھول جو اصلی تھے مصنوعی لگے گلدان میں

آپ کا انداز رہنا چاہیے تھا آپ تک
غیر بھی کرتا ہے گستاخی ہماری شان میں

شدّتِ تنہائی کی تاریخ گویا دفن ہے
میری تنہا چارپائی کے شکستہ بان میں

ساری دُنیا کر رہی ہے اُس کی صحراؤں میں تلاش
اور دیوانہ چھپا ہے میرؔ کے دیوان میں!

یار اُترنے کے لیے تو خیر بالکل چاہیے
بیچ دریا ڈوبنا بھی ہو تو اک پُل چاہیے

فکر تو اپنی بہت ہے بس تغزّل چاہیے
نالۂ بلبل کو گویا خندۂ گُل چاہیے

شخصیت میں اپنی وہ پہلی سی گہرائی نہیں
پھر تری جانب سے تھوڑا سا تغافل چاہیے

جن کو قدرت سے تخیّل پر انھیں دِکھتا نہیں
جن کی آنکھیں ٹھیک ہیں اُن کو تخیّل چاہیے

روز ہمدردی جتانے کے لیے آتے ہیں لوگ
موت کے بعد اب ہمیں جینا نہ بالکل چاہیے

○

اس میں رکھتی ہی نہیں اپنا کوئی ثانی ہوا
اچھے اچھوں کی کرے گی مرثیہ خوانی ہوا

لوگ بدلیں تو بدل جاتے ہیں سب یانی ہوا
شہر اپنا بھی ہو تو لگتی ہے بیگانی ہوا

آندھیوں کا مرتبہ اب تک نہیں جانی ہوا
کر رہی ہے دیکھیے کیسی یہ نادانی ہوا

بے مزا، بے کیف، بے ہنگام طوفانی ہوا
چل رہی ہے ہر طرف لفظوں کی بے معنی ہوا

آب و گل کے واسطے وجہِ پریشانی ہوا
دیکھتی آئی ہے صرف اپنی ہی آسانی ہوا

آگ کی مانند جو پہلے ہی جلتا ہو میاں
اور کچھ اس کی بڑھاتی ہے پریشانی ہوا

ہجر کی پُرنم ہوا سے آنکھیں نم ہونے لگیں
دید ہو جائے تو ہو آنکھوں کا یہ پانی، ہوا

اس کی آمد پر قصیدے ہم نے لکھے تھے مگر
خوب موسم ہے کہ ہم کو بھی نہ پہچانی ہوا

آگ اندر ہو تو باہر خاک کے لگتے ہیں سب
لگ گئی اپنی طبیعت کو بھی شیطانی ہوا

ایک گھر خوابوں کی اونچائی پہ تھا اپنا شجاع
جانے کیسے لے اڑی اس کو بھی میدانی ہوا

چھوڑیے باقی بھی کیا رکھا ہے ان کے قہر میں
جان درویشوں کو پیاری ہے ہمارے شہر میں

دیکھیے کیا حشر ہوتا ہے ہمارا دہر میں
شہرِ یاری کی تمنا، اور تیرے شہر میں

دیکھنے والے کو سارا ہی سمندر چاہیئے
سوچنے والا سمندر سوچ لے اک لہر میں

دیکھیے تاثیر خالی زہر میں ہوتی نہیں!
زندگی تھوڑی ملا کر کھائیے گا زہر میں

اُن سے یُوں تشبیہہ دیتا ہُوں کہ وہ بھی دُور رہیں
ورنہ کیا مِلتا ہے تجھ میں اور ماہ و مہر میں

تنگیٔ ہیئت سے ٹکراتا ہُوا جوشِ مواد!
شاعری کا لُطف آجاتا ہے چھوٹی بحریں!
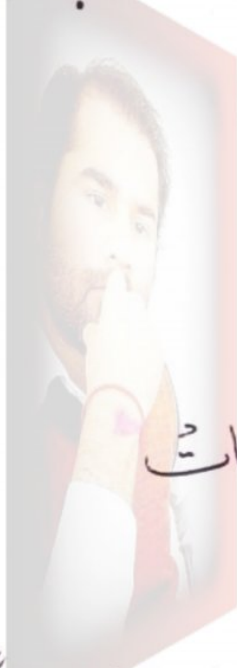
متفرقات

رات آنگن میں مِرے چاند تھا، سب جان گئے
خیریت پُوچھی تو اغیار بُرا مان گئے

دِل میں نفرت ہو تو چہرے پہ بھی لے آتا ہُوں
بس اِسی بات سے دُشمن مجھے پہچان گئے

○

دوست کا گھر اور دشمن کا پتہ معلوم ہے
زندگی ہم کو ترا سب سلسلہ معلوم ہے

زندگی ہا جا ہم بھی کوئے آرزو تک آ گئے
اس سے آگے ہم کو سارا راستہ معلوم ہے

کیا منجم سے کریں ہم اپنے مستقبل کی بات
حال کے بارے میں ہم کو کون سا معلوم ہے

یا تو جو نافہم ہیں وہ بولتے ہیں ان دنوں
یا جنھیں خاموش رہنے کی سزا معلوم ہے

شعر پر تو آپ کی قدرت مسلّم ہے شجاعؔ
اس زمانے کا بھی کچھ اچھا برا معلوم ہے

○

کائناتی غم بھی ذاتی مسئلوں کی بات ہے
ٹھیک تھا سب کچھ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے

کام چلنا ہو غزل سے تو چلے دنیا کا کام
اور یوں دیکھو تو خالی قافیوں کی بات ہے

واقعی پتھر ہی پتھر ہیں فلک کی جیب میں
ہے بڑی سچی اگرچہ شاعروں کی بات ہے

گرمیوں میں اب کے ٹھنڈک ہے تو حیرت کس لیے
کس قدر گرمی تھی پچھلی سردیوں کی بات ہے

اِن دنوں تو دھوپ کی شدت ہے اور ہم ہیں شجاع
باقی جو کچھ ہے وہ پچھلی بارشوں کی بات ہے

کیا کیا جائے یہی اللہ کو منظور ہے
دِلّی آ کر بھی یہ لگتا ہے کہ دِلّی دور ہے

وہ تجلّی ہے نہ موسیٰ ہے نہ کوہِ طور ہے
لمحۂ موجود امکانات سے بھرپور ہے

ہر مثل کو تجربوں نے میرے جھٹلایا مگر
تجربے گمنام ہیں اور ہر مثل مشہور ہے

دوستو اپنی سمجھ میں تو یہ سب آتا نہیں
سانس لیتے جائیے یہ بھی عجب دستور ہے

ہوش والے دشت کی جانب گئے تھے ایک دن
تب سے دیوانہ سنا ہے دشت سے مفرور ہے

دل تمنا کر رہا ہے اور اندیشہ دماغ
اپنے اپنے کام پر ہر عارضہ مامور ہے

آج کل بس شاعری کرتا ہے روز و شب شجاعؔ
شہر ہی ایسا ہے، بے چارہ بڑا مجبور ہے

متفرقات

سوچ کر دیکھ لیا ہم نے ہر اک پہلو سے
بات بنتی ہی نہیں خونِ تمنا کے بغیر

قُم بِ اِذنی کا پڑھا جانا تو اچھا ہے مگر
مردے جیتے نہیں اعجازِ مسیحا کے بغیر

○

گرچہ بادل پانی برساتا ہُوا گھر گھر پھرا
پھر بھی بارش کی دُعا کرتا رہا اک سر پھرا

ایک اُمّی کو ملی اپنے ہی دل میں کائنات
اور میں عالم تلاشِ ذات میں در در پھرا

ہم زمانے سے پھرے یہ تو بجا ہے صاحبو!
اس کو تو لاؤ جو ہم سے، آشنا ہو کر پھرا

اس کی خوش فہمی نے کل بس مار ہی ڈالا ہمیں
تجھ کو دیکھا اور دروازے سے چارہ گر پھرا

آب ہے وہ آئی جو چھڑکی بر عدو کے بعدِ وصل
اور پانی ہے وہ جو میری آرزوؤں پر پھرا!

○

ہم سے بھی حل ہو نہ پائے اپنے ذاتی مسئلے
ہم بھی حل کرنے لگے ہیں کائناتی مسئلے

زندہ رہنے کی تھکن نے مار ڈالا خضر کو
پھر بھی پیدا کر رہی ہے بے ثباتی مسئلے

بیخودی میں ہم ملا بیٹھے ترے جانے کے بعد
انفرادی مسئلوں میں کائناتی مسئلے

کیا ستم ہے مسئلے الجھائے میری احتیاط
اور سلجھائے مری بے احتیاطی مسئلے

مسئلوں کے حل نے کیسا خون رلوایا ہمیں
جان لیتی گریہ دنیا، بھول جاتی مسئلے

دَردُ میرے بعد بالکُل جوں کا توں باقی رَہا
جَیسے مجنوں مر گیا لیکن جُنوں باقی رَہا

کُچھ انھیں رشتوں سے اِس دل کا سکوں باقی رَہا
ٹوٹنے کے بعد بھی جن کا فسوں باقی رَہا

مِٹ گئے ہیں صُورِ اسرافیل سے پہلے ہی سَب
پھر قیامت کے لیے اک مَیں ہی کیوں باقی رَہا

محفلوں کے بیچ جب تنہائیاں رکھ آئے ہم
قہقہوں کی تہہ میں اک سوزِ دروں باقی رَہا

اُن کا طرز اپنا لیا اسلوب اپنا چھوڑ کر
بس یہ بندہ قاتلوں کے بیچ یوں باقی رَہا

رفتار آندھیوں کی ابھی سے بتا کے رکھ
اس مسئلے کو سامنے فوراً ہوا کے رکھ

ممکن ہے کل کھلے کہ یہ سب کچھ فضول تھا
پس آج کے بھی کام کو کل پر اٹھا کے رکھ

اچھی نہیں ہے ہر کس و ناکس کی واہ واہ
الفاظ کی تہوں میں معانی چھپا کے رکھ

جذبات کے دبانے سے دبتی ہے شخصیت
یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ ان کو دبا کے رکھ

اَچھی گزر رہی ہے تو ابہام ٹھیک ہے
ترسیل ٹیڑھے وقت کی خاطر بچا کے رکھ

اندر سے جو بھی حال ہو گھر کا ہُوا کرے
باہر سے آرزو کا دریچہ سجا کے رکھ

مُنہ پر ہر ایک بات کو لاتا ہے کیوں شُجاع
دو ایک باتیں دل میں بھی بندے خدا کے، رکھ

○

لکھنے لگے ہیں نام ہم اپنا لقب کے ساتھ
تھوڑا سا اختلاف ضروری ہے سب کے ساتھ

رختِ سفر میں اتنے نہ لو خواب اب کے ساتھ
دو ایک خواب تو ہیں چلو خیر سب کے ساتھ

اس کشمکش میں جان گنوانا فضول ہے
سمجھوتہ کر لیا ہے میاں روز و شب کے ساتھ

کس منہ سے شاہِ وقت پہ تنقید ہم کریں
ہم خود سلام کرتے ہیں اس کو ادب کے ساتھ

اسلوب سے زیادہ کوئی شے نہیں عزیز
لکھتا ہوں مدح میں بھی مگر اپنے ڈھب کے ساتھ

تازہ غزل نہیں تو پرانی سنائیے
کیا روز روز مرثیہ خوانی، سنائیے

بہتر زبانِ حال سے کوئی زباں نہیں
بولے بغیر ساری کہانی سنائیے

خوابوں کا ذکر مصرعِ اولیٰ میں ہو چکا
اب صاف صاف مصرعِ ثانی سنائیے

کاوشِ دماغ کی ہو تو تحریر کیجیے
دل کی حکایتوں کو زبانی سنائیے

رَدِّ عَمل سے آپکے اُبھریں گے واقعات
سنیے ہماری داستاں یعنی سُنائیے

پانی تو بند آج بھی خلق خدا پہ ہے
کیوں بند ہے انیس بیانی سنائیے

چرچا حقیقتوں کا بہت ہو چکا شجاع
گلفام اور پری کی کہانی سنائیے

مصروف جو رہتے ہیں انہیں کچھ نہیں ملتا
بیکار رہو گے تو کوئی کام ملے گا

سید حسین احسن

○

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

مایوسیوں نے گھیر لیا سارا آسماں
رات آرزو کا چاند زمیں پر پڑا رہا

اس کو خدائیوں کی سزا مل گئی، مگر
سجدوں کا داغ میری جبیں پر پڑا رہا

کیا بات تھی کہ ملتے رہے دوسروں کو تاج
پھر بھی ہما کا سایہ ہمیں پر پڑا رہا

خانہ بدوشیوں کا ستایا ہوا تھا وہ
دو گز زمیں ملی تو وہیں پر پڑا رہا

جب بھی کسی سے ترکِ تعلق کیا کرو
جو بات منہ پہ آئے وہی کہہ دیا کرو

پیدا جنوں میں ایک نیا زاویہ کرو
وحشت بڑھے تو چاکِ گریباں سیا کرو

یہ زیرِ لب کی بات تو ہے شاعروں کی بات
تنقید کر رہے ہو تو اعلانیہ کرو

امیدِ مرگ ہے گزر اوقات کے لیے
اب زندگی کا کام تو بس شوقیہ کرو

اس درجہ احتیاط بھی اچھی نہیں شجاع
جب کچھ نہ بن پڑے تو میاں رو لیا کرو

اِس مرحلے پہ یارو نہ خوفِ عدو کرو
عزّت اسی میں ہے کہ وہی آرزو کرو

تنہائیوں کا شور نہ یوں چار سو کرو
اِس مسئلے پہ بزم میں کچھ گفتگو کرو

تبلیغ اس کے حسن کی نیکی کا کام ہے
اغراق سے نہ کام چلے تو غلو کرو

یا اس بہار پہ بھی کرو وحشتوں کے وار
یا پھر کہیں پہ جا کے گریباں رفو کرو

جینا تو خیر یوں بھی کٹھن تھا، مگر میاں
مرنا بھی کوئی سہل نہیں، جستجو کرو

کیسی غزل شجاع کہی ایسے دور میں
مقطع کا ہے مقام بس اللہ ہو کرو

متفرقات

شعر خود کہنے لگے ہیں اہلِ ذوق
ہم کہاں جائیں سنانے شاعری

جانتے ہیں صرف ہم جیسے مگر
بولتے ہیں سب زبانِ شاعری

کیا حسینوں کے ستم کس کی جفا
دوستو اب تم ہو جانِ شاعری

○

اُس بے وفا کا شہر ہے اور وقت شام ہے
ایسے میں آرزو ــــ بڑی ہمت کا کام ہے

آرائشِ غزل کے لیے ذکرِ جام ہے
حالانکہ واعظوں میں ہمارا بھی نام ہے

ہم کو بھی چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا
جذبوں کا قافلہ بھی بڑا تیز گام ہے

بے آرزو بھی خوش ہیں زمانے میں بعض لوگ
یاں آرزو کے ساتھ بھی جینا حرام ہے

لفظوں کی جان چھوڑ دے مفہوم کو پکڑ
ورنہ یہ سب معاملہ تجنیسِ تام ہے

توبہ کے سلسلے میں بس اتنا کہیں گے ہم
مسلک ہو بادہ نوشی تو توبہ حرام ہے

آنکھوں کا ہے خیال کہ دانہ ہے دام میں
اور فکر کہہ رہی ہے کہ دانے میں دام ہے

نقاد تم کو پوچھتے آئے تھے کل شجاع
کہتے تھے شاعروں میں تمھارا ابھی نام ہے

کچھ بھی نہ ہاتھ آیا وصیّت کے باوجود
نادار ہوں بزرگوں کی دولت کے باوجود

ہمّت ہے تو جلائے ہماری طرح کوئی
شمعِ خیال بادِ حقیقت کے باوجود

اپنے تعلقات سبھی سے رہے مگر
کچھ کشمکش تھی میل مروّت کے باوجود

ذات اور کائنات کے ثالث بنے رہے
مصروفیت رہی ہیں فرصت کے باوجود

یہ واقعی بڑے ہی تعجب کی بات ہے
دُنیا اسی جگہ ہے قیامت کے باوجود

سب کا ہی نام لیتے ہیں اک تجھ کو چھوڑ کر
خاصا شعور ہے ہمیں وحشت کے باوجود

کل تک شجاع جس کی عنایت پہ ہم جیے
اب جی رہے ہیں اس کی عنایت کے باوجود

پانی کی آڑ میں یہ سمندر میں کون ہے
نظروں کو کیا پتہ ہے کہ منظر میں کون ہے

یادوں کے ڈھیر نے کو جگہ کی کمی نہیں
تنہائی کے علاوہ مرے گھر میں کون ہے

تعریف اپنی تجھ سے کیے جا رہا ہے غیر
یہ بھی پتہ نہیں کہ برابر میں کون ہے

کچھ منزلیں عظیم ہیں کچھ راہ رو عظیم
دیکھیں شجاعؔ کس کے مقدر میں کون ہے
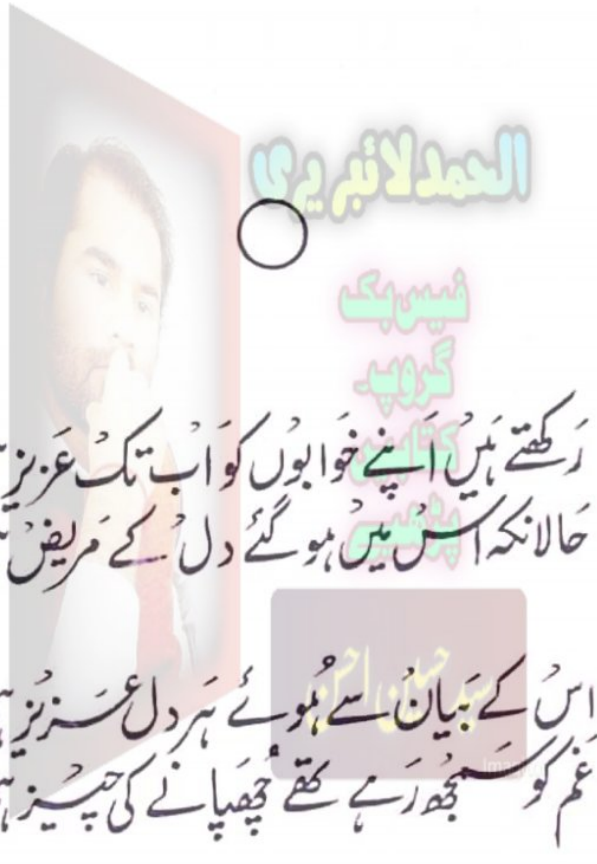
رکھتے ہیں اپنے خوابوں کو اب تک عزیز ہم
حالانکہ اس میں ہو گئے دل کے مریض ہم

اس کے بیاں سے ہوئے ہر دل عزیز ہم
غم کو سمجھ رہے تھے چھپانے کی چیز ہم

یہ کائنات تو کسے ملتی ہے ـــــ چھوڑیے
اپنی ہی ذات سے نہ ہوئے مستفیض ہم

چارہ گری کی بات کسی اور سے کرو
اب ہو گئے ہیں یارو پرانے مریض ہم!

○

جو زندگی ملی وہ کتابوں میں لگ گئی
اور شاعری جو کی وہ نصابوں میں لگ گئی

تیرے بدن نے پھونک دیے فلسفے تمام
کل رات آگ میری کتابوں میں لگ گئی

بالا تھے شخصیات سے زاغ و زغن مگر
یہ مسئلہ اٹھا تو عقابوں میں لگ گئی

اتنی حقیقتوں کو تو میں کیا سنبھالتا
تھوڑی سی چوٹ میرے ہی خوابوں میں لگ گئی

بالکل نئی زبان میں کچھ شعر کہہ شجاعؔ
وہ شاعری نہ تھی جو نصابوں میں لگ گئی

اُس کا خیال آگیا ذکرِ عدو کے بعد
ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں گرم لُو کے بعد

اپنی تلاش ہو گی تری جستجو کے بعد
ظاہر ہے ہم نماز پڑھیں گے وضو کے بعد

ایسا لگا دِوانے سے کل گفتگو کے بعد
کچھ اور ہو گیا ہے گریباں رفو کے بعد

آخر عزیز کیوں نہ ہوں ناکامیاں ہمیں
حاصل ہوئی ہیں یہ بھی بڑی جستجو کے بعد

اِس قافیہ پہ مقطع بہت ٹھیک ہے شجاع
کچھ بھی نہیں ہے نعرۂ اللہ ہُو کے بعد

ٹُوٹے ہیں پاؤں اور فلک ہے نگاہ میں
کچھ رہ گئی کمی مرے حالِ تباہ میں

اپنی ہی شخصیت سے ہیں یوں زیرِ بار ہم
دب جائے جیسے شعر کوئی واہ واہ میں
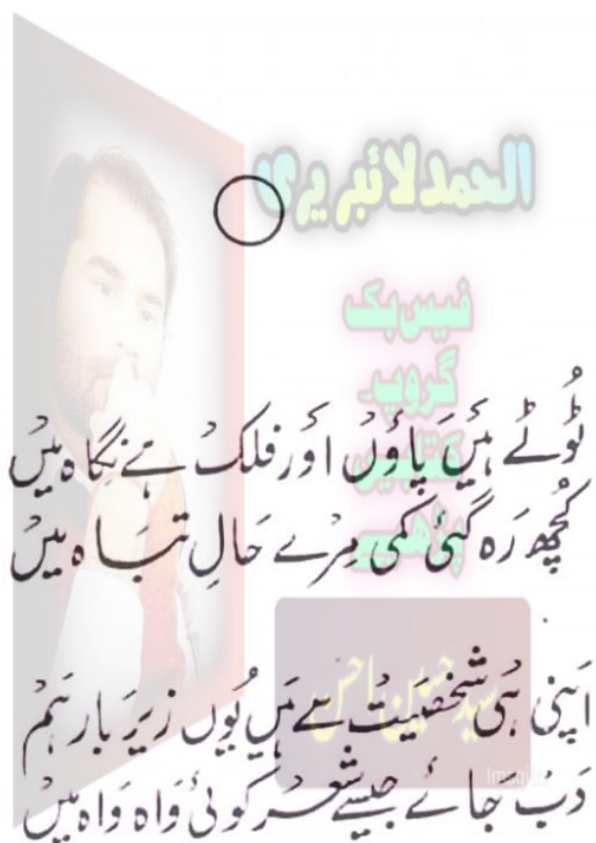
واعظ بھی جب سے پینے لگا میرے ساتھ ساتھ
باقی نہیں رہی کوئی لذت گناہ میں

کچھ فرق رنگ میں ہے مگر نقش ہیں وہی
سنجیدگی کا خون ہے طنز و مزاح میں

کچھ شرم اب تجھے بھی تو آئے گی شاہِ وقت
لے ہم بھی آ گئے ہیں تری بارگاہ میں !

ہم نے غزل میں اس کے سوا سب کی بات کی
اب اس کو آپ کچھ بھی کہیں اصطلاح میں

گرمی ہے شہر دل میں ابھی تک مگر شجاع
ماحول کافی سرد ہے گرد و نواح میں !

متفرق

امیدوں نے اندھیرا کر دیا ہے
اداسی کے ستارو تم ہی چمکو

فرسودہ قارئین کو چکر میں ڈال دے
تاریکیوں کو صبح کے منظر میں ڈال دے

آسیب ہے سخن پہ بڑا لفظیات کا
مفہوم لفظ لفظ کے پیکر میں ڈال دے

موسم کا ظلم پھیلتا جاتا ہے ہر طرف!
عرضی اک آسمان کے دفتر میں ڈال دے

غرقاب ایک جام میں سب آنسوؤں کو کر
دریا تمام ایک سمندر میں ڈال دے

پہچان میری شہرِ حقیقت میں کچھ تو ہو
دشتِ خیال! خاک مرے سر میں ڈال دے

دشوار ہے شراب میں ساغر کو ڈالنا
اے مجتہد، شراب ہی ساغر میں ڈال دے

قبضہ ہمارے گھر پہ اداسی کا ہے شجاع
خوابوں کا مال اور کسی گھر میں ڈال دے

تُو بھی مِرے خیال سے ہو کر نہیں گیا
اور مَیں بھی کچھ دنوں سے فلک پر نہیں گیا

ڈر تھا وہاں بھی شہرِ حقیقت نہ ہو کہیں
پس میں دیارِ خواب کے اندر نہیں گیا

حالانکہ اس کے بعد ملاقات بھی ہوئی
دل سے تری جُدائی کا منظر نہیں گیا

خیر اُس کی بے نیازی تو تسلیم ہے مگر
اس کے بغیر مَیں بھی کوئی مر نہیں گیا

دل نے تری گلی سے کنارہ نہیں کیا
ظالم نے ایک کام ہمارا نہیں کیا

ہم بے خیالیوں کے جہنم میں جل گئے
جس وقت بھی خیال تمہارا نہیں کیا

دُنیا کی بات چھوڑیے دُنیا تو غیر تھی
تم نے بھی کچھ خیال ہمارا نہیں کیا

ساماں اُداسیوں کا بہت گھر میں تھا شجاع
ایک اُس کی آرزو پہ گزارا نہیں کیا

خاموش ہے موسیٰ بھی ہاتھوں میں عصا رکھے
گھر نیل کے دریا پر اب میری بلا رکھے

اب یاں کوئی جینے کی امید بھی کیا رکھے
پھرتے ہیں مسیحا بھی ہونٹوں پہ دعا رکھے

میں اُس کی خموشی کا ہر وقت کروں شکوہ
وہ میرے تکلم پر الزام سدا رکھے

اس شہر کی رونق سے انکار نہیں، لیکن
تنہائی ابھی اپنی باقی ہے خدا رکھے

لفظوں کی تنگ ظرفی پہچانے اگر شاعر
مفہوم کو لفظوں کے باہر بھی ذرا رکھے

احباب کے مجمع میں اک یار نہیں ایسا!
جو دل میں مروت اور ہونٹوں پہ گلہ رکھے

متفرقات

عمر بھر دوستوں نے محنت کی
پر ہمیں دوستی نہیں آئی!

اپنے ہی گھر پہ آ نکلتے ہیں
ہم کو آوارگی نہیں آئی!

زندگی بن گئی عدو کی شجاع
اور ہمیں موت بھی نہیں آئی!

تاریخ کی خاطر بھی دو ایک نشاں چھوڑو
اندر ہی جلو لیکن باہر تو دھواں چھوڑو

یہ تنگ خیالی کی باتیں ہیں میاں چھوڑو
ایک اس کا ہی کوچہ کیا سارا ہی جہاں چھوڑو

کہتے ہیں کہ تب آنا جب آہ و فغاں چھوڑو
اس بزم میں جاؤ تو اس دل کو کہاں چھوڑو

ہر بات کہو کھل کر ذو معنی زباں چھوڑو
یا کعبے سے منہ پھیرو یا کوئے بتاں چھوڑو

اظہار کی خوبی کا اس پر نہ اثر ہو گا
ملنے کا سبب ڈھونڈو فرقت کا بیاں چھوڑو

ان تیز اجالوں سے بینائی کو خطرہ ہے
جیسے بھی بنے فوراً خوابوں کا مکاں چھوڑو

کون آپ کی باتوں میں آئے گا شجاع[1] صاحب
اشعار سے کیا دنیا بدلے گی، اماں چھوڑو
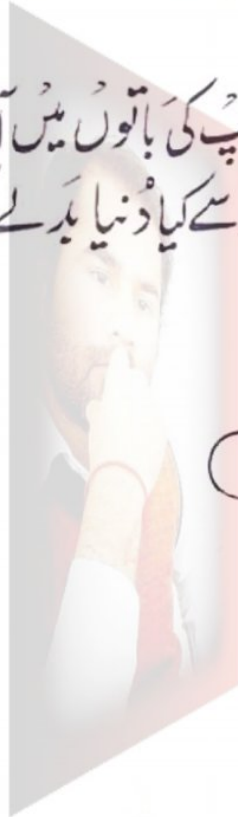
[1] کیونکہ لفظ شجاع کی صوتی ادائیگی 'ع' پر اتنا اصرار نہیں کرتی جتنا اس لفظ کی تحریر، اور کیونکہ گفتگو میں 'شجا' ہی نمایاں رہتا ہے اس لیے میں شعری سہولت کے تحت کبھی کبھی اس لفظ کو بطورِ وتد مجموع باندھ لینا قبیح نہیں سمجھتا۔ (شجاع خاور)

پاؤ گے بڑی شہرت گر کام یہ کر جاؤ
جینا نہیں آتا تو خاموشی سے مر جاؤ

یوں ٹوٹنا ویسے تو اچھا نہیں ہوتا ہے
اب ٹوٹ گئے ہو تو ہر سمت بکھر جاؤ

یہ حال ہوا ہے تو کس کام کا مستقبل
ماضی کے سمندر میں چپکے سے اتر جاؤ

تبدیلیٔ موسم کو جائیں تو کہاں جائیں
سب ایک سا موسم ہے اس وقت جدھر جاؤ

جب آ ہی گئے اس کے کوچے سے گزر کر اب
جلدی سے لگے ہاتھوں جاں سے بھی گزر جاؤ

ویسے تو مضر ہوگا خوابوں کی طرف جانا
پھر لوٹ کے مت آنا بالفرض اگر جاؤ

یوں آ کے فلک پر تم خاموش شجاع کیوں ہو
یا توڑ لو تاروں کو یا لوٹ کے گھر جاؤ

برابر جس کی عظمت کا یہاں دم بھر رہے ہیں لوگ
اسی کے سامنے جاتے ہوئے بھی ڈر رہے ہیں لوگ

ستارے چاند سورج آسماں، سب خیریت سے ہیں
وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا یہاں پر مر رہے ہیں لوگ

جو دل ہی دل میں شرمندہ ہے اپنی سب خطاؤں پر
اسی کے سامنے میری برائی کر رہے ہیں لوگ

کبھی اظہار کی بے مائگی ایسی نہیں دیکھی
پریشاں گرچہ اس سے پہلے بھی اکثر رہے ہیں لوگ

زمیں کے مسئلوں کو سامنے رکھ کر اگر دیکھو
فرشتوں سے بھی نظم و ضبط میں بہتر رہے ہیں لوگ

تری فتنہ گری ہے ہر طرف یہ جانتے ہیں سب
مگر الزام رسماً آسماں پر دھر رہے ہیں لوگ

شجاعؔ ان کی کئی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے
یہاں آنے سے پہلے چاند تاروں پر رہے ہیں لوگ

○

مرا کردار الجھن بن رہا ہے اور قاری مزے میں ہے
کہانی یوں سمجھیے فیصلہ کن مرحلے میں ہے

مری رُوداد کا سارا نچوڑ اس واقعے میں ہے
کہانی پیر میں زنجیر لے کر بھاگنے میں ہے

یہاں تو خیر پھر بھی شعریت کے دائرے میں ہے
تخیل شاعری سے بھی زیادہ فلسفے میں ہے

مرے گھر کے سوا اس شہر بھر میں کچھ نہیں ہوتا
سلیقہ کس قدر روز آنے والے زلزلے میں ہے

اسے تو مسکرا کر بات ہی کرنی نہ آتی تھی!
کہیں سے پی کے آیا ہے شجاع خاور نشے میں ہے

○

دماغ اب آپ خود ہی دیکھیے کیا مجھ بشر کا ہے
یہ سب زنجیریں پاؤں میں ہیں اور سودا سفر کا ہے

وہاں پر دل جگر کی بات کبھی سنتا نہیں کوئی
یہاں پر مسئلہ ہی اصل میں دل اور جگر کا ہے

سبھی طوفان کی زد پر ہیں جب اور صاف بے نقشہ
تو پھر کیا دیکھنا یارو ہوا کا رخ کدھر کا ہے

ضرورت سخت اک پتھر کی ہے شیشوں کی بستی میں
ذرا معلوم تو ہو کیا ارادہ اپنے سر کا ہے

کہاں سے ابتدا کیجیے بڑی مشکل ہے درویشو!
کہانی عمر بھر کی اور جلسہ رات بھر کا ہے

O

بُرائی لوگ کرتے رہتے ہیں دن رات پتھر کی
ذرا اک دن سُنی تو جائے چل کر بات پتھر کی

رہی مصروفیت میری طرح حضرات، پتھر کی
زمانے بھر کے شیشے اور تنہا ذات پتھر کی

کہانی کس قدر دِل دوز ہے حضرات پتھر کی
ستم ہے، پتھروں کے بیچ تنہا ذات پتھر کی

اگرچہ ہم کو بھی معلوم ہے اوقات پتھر کی
مگر وحشت میں پھر درکار ہیں خدمات پتھر کی

نئی دُنیا بنی تو اس سے بالکل مختلف ہوگی
خدا شیشے کا ہوگا اور مخلوقات پتھر کی

ابھی کل تک یہ منظر سوچ بھی سکتا تھا نہ کوئی!
کہ شیشے بیٹھ جائیں گے لگا کر گھات پتھر کی

میاں جو آدمی شیشے کی سنگینی کا قائل ہو
وہی سمجھے تو سمجھے شدتِ جذبات پتھر کی

شجاعؔ اتنی کبھی گہری شاعری اچھی نہیں ہوتی
قلم ہے پھول سا اور لکھ رہے ہو بات پتھر کی

○

بُرائی لوگ کرتے رہتے ہیں دن رات پتھر کی
ذرا اک دن سُنی تو جائے چل کر بات پتھر کی

رہی مصروفیت میری طرح حضرات، پتھر کی
زمانے بھر کے شیشے اور تنہا ذات پتھر کی

کہانی کس قدر دِل دوز ہے حضرات پتھر کی
ستم ہے، پتھروں کے بیچ تنہا ذات پتھر کی

اگرچہ ہم کو بھی معلوم ہے اوقات پتھر کی
مگر وحشت میں بھی درکار ہیں خدمات پتھر کی

نئی دنیا بنی تو اس سے بالکل مختلف ہو گی
خدا شیشے کا ہو گا اور مخلوقات پتھر کی

ابھی کل تک یہ منظر سوچ بھی سکتا تھا نہ کوئی!
کہ شیشے بیٹھ جائیں گے لگا کر گھات پتھر کی

میاں جو آدمی شیشے کی سنگینی کا قائل ہو
وُہی سمجھے تو سمجھے شدّتِ جذبات پتھر کی

شجاع اتنی کبھی گہری شاعری اچھی نہیں ہوتی
قلم نے پھول سا اور لکھ رہے ہو بات پتھر کی

○

خطا اک شخص کی اور ساری دنیا سے کھنچے رہنا
میاں اچھا نہیں لگتا ہے یوں گھر میں پڑے رہنا

یہاں پر ٹھیک ہے باہر سے بے حس ہی بنے رہنا
مگر اندر کی ہے بات اور، اندر سے سجے رہنا

کسی کو غور سے اوّل تو دیکھیں گے نہیں یہ لوگ
اگر دیکھیں تو اپنی ذات کے پیچھے چھپے رہنا

نہیں تبدیل ہوتا تبصروں سے کوئی بھی کردار
تماشائی کو کافی ہے تماشا دیکھتے رہنا

نہ جانے کب سے ہم ثابت قدم لوگوں کا شیوہ ہے
کوئی امید رکھنا یا کسی امید پے رہنا

مصیبت تو تب آتی ہے جب اپنی بات کہنی ہو
وگرنہ سہل ہے اوروں کے موقف پر جمے رہنا

بہت سے دوستوں کے بہرے گھر بیٹھے نظر آئے
بڑا اچھا رہا دشمن کے گھر کے سامنے رہنا

حقائق کو کچل کر آگیا لشکر خیالوں کا
شجاع اب تم خیالستان میں آرام سے رہنا

○

خطا اک شخص کی اور ساری دنیا سے کھنچے رہنا
میاں اچھا نہیں لگتا ہے یوں گھر میں پڑے رہنا

یہاں پر ٹھیک ہے باہر سے بے حس ہی بنے رہنا
مگر اندر کی ہے بات اور، اندر سے سجے رہنا

کسی کو غور سے آؤ تو دیکھیں گے نہیں یہ لوگ
اگر دیکھیں تو اپنی ذات کے پیچھے چھپے رہنا

نہیں تبدیل ہوتا تبصروں سے کوئی بھی کردار
تماشائی کو کافی ہے تماشا دیکھتے رہنا

نہ جانے کب سے ہم ثابت قدم لوگوں کا شیوہ ہے
کوئی امید رکھنا یا کسی امید پہ رہنا

مصیبت تو تب آتی ہے جب اپنی بات کہنی ہو
وگرنہ سہل ہے اوروں کے موقف پر جمے رہنا

بہت سے دوستوں کے چہرے گھر بیٹھے نظر آئے
بڑا اچھا رہا دشمن کے گھر کے سامنے رہنا

حقائق کو کچل کر آ گیا لشکر خیالوں کا
شجاع اب تم خیالستان میں آرام سے رہنا

ہمارے دوستوں کے خط نہایت مخلصانہ ہیں
اگرچہ شعر جو لکھے ہیں بالکل عامیانہ ہیں

ستارے توڑ کر لانے سے پہلے وہ یہ کہتا تھا
ستارے توڑ کر لانے کی باتیں شاعرانہ ہیں

سنو تو ان میں اک بالکل نیا انداز پاؤ گے
اگرچہ دیکھنے میں اپنی باتیں جاہلانہ ہیں

زمانے کی زبوں حالی پہ اللہ رحم فرمائے
اِدھر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رشکِ زمانہ ہیں

زمیں سے دل لگاؤ تو پریشاں خواب آتے ہیں
کبھی پڑتا ہے سوکھا اور کبھی سیلاب آتے ہیں

سفر میں آرزو کے خوب کام آتی ہے محرومی
جو تشنہ کام جاتے ہیں وہی سیراب آتے ہیں

سمندر کے سفر میں اک سمندر ہی نہیں آتا
بڑے دریا، بڑی نہریں، بڑے تالاب آتے ہیں
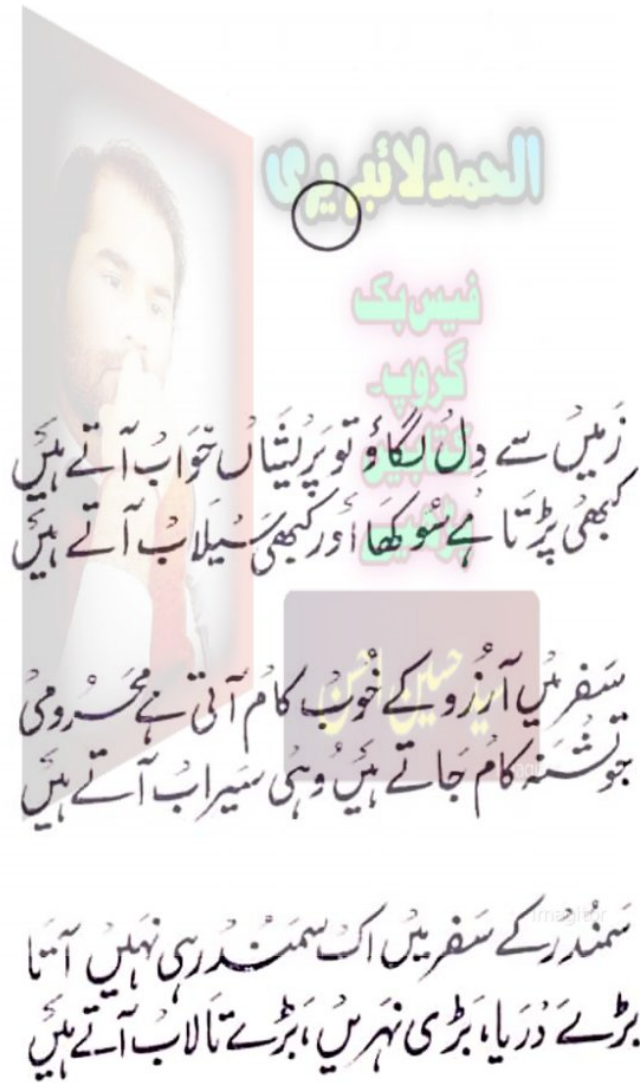
ہماری شخصیت کا کچھ تعیّن ہی نہیں ہوتا!
ادھر کچھ دن سے ہر خط میں نئے القاب آتے ہیں

کسی اک شخص کو دونوں جہاں اکثر نہیں ملتے
متاعِ لفظ ملتی ہے تو سیم و زر نہیں ملتے

ذرا دیکھو کہانی میں بھی یہ منظر نہیں ملتے
بڑا انبار ہے جسموں کا لیکن سر نہیں ملتے

پرانے فن کے ماہر شہر میں پہلے ہی عنقا تھے
نئے فن کے بھی اب معقول کاریگر نہیں ملتے

تخیل کی صداقت دن بہ دن کم ہوتی جاتی ہے
خیالستان میں بھی اب پری پیکر نہیں ملتے

مِرے وہ شعر جو سارے زمانے کو پسند آئے
تعجب ہے مِرے دِیوان کے اندر نہیں مِلتے

فلک پر روز کوئی کام پڑ جاتا ہے دُنیا کا
کبھی تو رات کو ہم اپنے بِستر پر نہیں مِلتے

کِسی موسم میں دونوں خواہشیں پُوری نہیں ہوتیں
چمن میں پُھول ہوں تو دشت میں پتّھر نہیں مِلتے
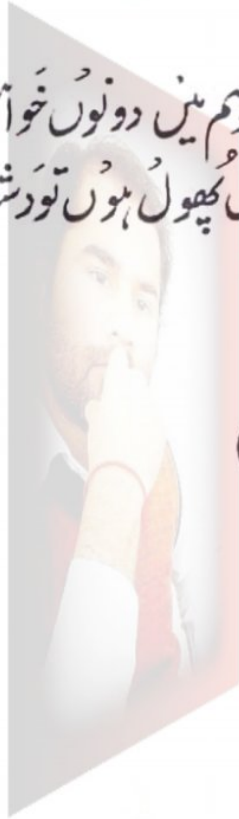
رَوایت ہَم تَلک آجائے گی، ایَسا نہَیں لگتا
ہَمارا قتل اُس کے ہاتھ سے ہوتا نہیں لگتا

وَہاں کیوں جاؤں مَیں کوئی جہاں اَپنا نہَیں لگتا
تُمھاری بَزم میں تو غیر بھی تنہا نہیں لگتا

مری مانند تو کوئی بھی افسردہ نہیں لگتا
مرے دیوان کا اک شعر بھی میرا نہیں لگتا

زمیں اب چاندنی سے مجھ کو ملنے ہی نہیں دیتی
میں ہر شب جاگتا رہتا ہوں پر موقع نہیں لگتا

تاثر اپنا اپنا ہے میاں ہر شخص کا، مثلاً!
ہمیں کوئی سمندر کی طرح پیاسا نہیں لگتا

سنائے وصل کی شب ہر کس و ناکس کے شعر اُس کو
پر اب فرقت میں اپنا شعر بھی اچھا نہیں لگتا

ذرا سوچو تو تنہائی کا مطلب جان جاؤ گے
اگرچہ دیکھنے میں کوئی بھی تنہا نہیں لگتا

نہ آئے کوئی تو لگتا ہے جیسے وہ نہیں آیا
وہ آجاتا ہے تو انداز ہی اُس کا نہیں لگتا

مزے کی بات ہے دنیا مجھے مردہ سمجھتی ہے
مجھے اپنے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں لگتا

تمیزیں مٹ گئی ہیں شہر میں اب سب برابر ہیں
کسی کا قد کسی سے اب ہمیں اونچا نہیں لگتا

کتابیں اتنی دل کش اور مضمون اتنے پُر آشوب
گھروں کے حال کا شہروں سے اندازہ نہیں لگتا

صبح دفتر بنی امیدوں کا
شام مایوسیوں کے کام آئی

دیکھتے دیکھتے ترا چہرہ
خود بخود قدرتِ کلام آئی

تناسب اِن دنوں ہر چیز کا بس اِس قدر سمجھو
نظر آئے گلی بھر تو اُداسی شہر بھر سمجھو

سبھی کے پاس کچھ کہنے کو ہے اور اس نے بھیجا ہے
وہی پیغام دے دے گا جسے پیغامبر سمجھو

یقیناً دور ہی کا ہے اُمید و یاس کا رشتہ
مگر خاصا قریبی ہے یہ رشتہ بھی ، اگر سمجھو

مِلا دیں گے سکوں کا سلسلہ بے چینیوں سے ہم
شبستانوں میں تم ہو تو ہمیں بھی در بہ در سمجھو

بغیر اس کے نئے شہروں تلک پہنچو گے کیا یارو
زوالِ شہر کے عرفان کو رختِ سفر سمجھو

مکمل رفتہ رفتہ ہو رہا ہے ایک اک کردار
فسانہ زندگی کا بس میاں انجام پر سمجھو

شجاع آخر غزل کے شعر تم کہنے لگے کب سے
نہ دردِ دل سے تم واقف نہ تم سوزِ جگر سمجھو

تکلف چھوڑ کر میرے برابر بیٹھ جائے گا
تصور میں ابھی وہ پاس آ کر بیٹھ جائے گا

ہمارے گھر میں تھوڑی دیر ابھی ٹھہرے گی تنہائی
ملاقاتی کوئی آیا تو باہر بیٹھ جائے گا

در و دیوار پر اتنا پڑا ہے سارے دن پانی
اگر کل دھوپ بھی نکلے گی تو گھر بیٹھ جائے گا

اڑے گا خود تو لائے گا خبر سات آسمانوں کی
اڑایا تو پرندہ چھت کے اوپر بیٹھ جائے گا

نہ منزل کو پتہ ہوگا نہ رستوں کو خبر ہوگی
مسافر ایک دن آرام سے گھر بیٹھ جائے گا

خیال اچھا ہوا تو شعر بن کر آئے گا باہر
بہت اچھا ہوا تو دل کے اندر بیٹھ جائے گا

مُتفرّقات

مصروف جو رہتے ہیں انھیں کچھ نہیں ملتا
بیکار پھروگے تو کوئی کام ملے گا!

اس وقت تو ڈوبے ہوئے تاروں سے سبق لو
سورج سے بھی اک درسِ سرِ شام ملے گا!

○

شہنشہ جس طرح سے خانقاہوں میں بھی ہوتے ہیں
فقیری سلسلے کے لوگ شاہوں میں بھی ہوتے ہیں

یقیں آیا ہے اب جب خود ہمارے ساتھ بیتی ہے
پڑھا تو تھا کہ رہزن سربراہوں میں بھی ہوتے ہیں

غزل کے نام پر خوب عورتوں[1] سے گفتگو کیجے!
مزے کیا کیا ادب کی اصطلاحوں میں بھی ہوتے ہیں

ستم کو دیکھتے رہنا ستم سے کم نہیں ہوتا
مرا دعویٰ ہے کہ قاتل گواہوں میں بھی ہوتے ہیں

---

[1] یہاں لفظ 'عورتوں' میں 'ع' کا صوتی کردار 'الف' جیسا ہے اس لیے میرے تئیں کوئی حرف ساقط نہیں ہوتا (شجاع)

Scanned with CamScanne

بھری آبادیوں میں جان کا خطرہ زیادہ ہے
اگرچہ حادثے سنسان راہوں میں بھی ہوتے ہیں

شجاعؔ وہ خیریت پوچھیں تو حیرت میں نہ پڑ جانا
پریشاں کرنے والے خیر خواہوں میں بھی ہوتے ہیں

متفرقات

جینے کی تمنا ہے تو یہ سال نکالو
دشوار تو کافی ہے، بہر حال نکالو

کل جن کو یقیں تھا کہ بدی مٹ کے رہے گی
اب وہ بھی یہ کہتے ہیں ذرا فال نکالو

○

دِل جل رہا ہے تو مِیاں آہ و فغاں جلدی کرو
کل تک بدل جائے گا یہ طرزِ بیاں، جلدی کرو

باہر نکل کر اب کہیں ڈھونڈو اماں، جلدی کرو
گِرنے لگا ہے ذات کا بودا مکاں جلدی کرو

اُڑتے ہوؤں کو گھورتا ہے آسماں، جلدی کرو
پرواز پر بس اب لگیں پابندیاں، جلدی کرو

جتنا بھی ہو، جیسے بھی ہو اسلوب بدلو شعر کا
محفل سے اُٹھ کر جا رہے ہیں نکتہ داں، جلدی کرو

مقطع کرو ورنہ شجاعؔ پوری غزل جل جائے گی
وہ اُٹھ رہا ہے صاف لفظوں سے دھواں جلدی کرو

اَب قہر بھی میرے خُدا کا دیکھیے
بس ہونے والا ہے دھماکا دیکھیے

کرنا تھا ہم کو دوستوں پر تبصرہ
اور لکھ گئے اپنا ہی خاکہ دیکھیے

کیسا غضب ڈھایا مری تشبیہ نے
بس اِن دنوں چلنا صبا کا دیکھیے

مضمون تو ہیں ہی ہمارے زوردار
اسلوب بھی ہے کس بلا کا دیکھیے

بے نام سی کر دی ہماری شخصیت
کیا وار ہے اُس کی وفا کا دیکھئے

موسم بدل جاتے ہیں خود ہی خود شجاعؔ
بس بیٹھے بیٹھے رُخ ہوا کا دیکھئے

مُتفرقات

دُنیا کے تو ہم پہلے ہی مشکور بہت تھے
اب اُن کی توجہ بھی کوئی خاص نہیں ہے

یہ گرم ہوائیں تو بہر حال بُری ہیں
موسم کی عنایت بھی ہمیں راس نہیں ہے

نقش نقش سے لکھوں آر پار تنہائی
اکیلا دیکھ کے بیٹھی دار تنہائی
العمود لائبریری
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن

اُس کی خوب رُوئی پر ختم اپنا فن سارا
آئنے کی حسرت میں مٹ گیا یمن سارا

فکرِ عاقبت میں ہم حال کو گنوا بیٹھے
رُوح کو بچانے میں جل گیا بدن سارا

آج بات خوشبو پر صاف صاف ہو جائے
اک طرف فقط وہ ہو اک طرف عدن سارا

زندگی چلی آئی ایک سیدھے رستے پر
رہ گیا دھرا یُوں ہی اپنا بانکپن سارا

یہ ہی مصرعِ اولیٰ یہ ہی مصرعِ ثانی:
مٹ گئیں اُمیدیں سب لُٹ گیا چمن سارا

دشت گردی کا ارادہ کر لیا ہے
ہم نے اک گھر شہر کے اندر لیا ہے

اپنے ذمے کارِ دنیا ہم نہ لیتے
یہ تو تجھ سے چھوٹ جانے پر لیا ہے

ہر کس و ناکس کو زندہ کرنے والو
کیا مسیحائی کا دھندہ کر لیا ہے

یہ حقیقت بھی بڑی ظالم ہے بھائی
جرم خوابوں کا تھا ہم کو دھر لیا ہے

سامنے آتا نہیں ہے کوئی شیشہ
جب سے ہم نے ہاتھ میں پتھر لیا ہے

پھر شجاع آتا ہے پتھر کا زمانہ
کس کے رہنے کے لیے یہ گھر لیا ہے

متفرقات

جو دل سے برا ہے وہ بہر حال برا ہے
دو آنکھیں بھی رکھتا ہو تو دجال برا ہے

کب آئے گا سال اچھا بتاتا نہیں کوئی
سب یہ کہے جاتے ہیں کہ یہ سال برا ہے

○

اِک ہمیں پہ کام کا ہے بار سارا
شہر جب سے ہو گیا بیکار سارا

عطر پی جاتے ہیں خود عطّار سارا
دیکھتا رہتا ہے بس سنسار سارا

سارا گھاٹا بھی اسی کو جھیلنا ہے
جِس کے ہاتھوں میں ہے یہ بیوپار سارا

لوٹ کر گھر تو چلے آئے سفر سے
راستہ آگے کا ہے دشوار سارا

کون اب کس کی کرے تیمار داری:
گھر پڑا ہے اِن دنوں بیمار سارا

کر گیا بارش میں کیسا کام پانی
کام بالکل آگ کا، اور نام پانی!

زندگی کا ہے زیاں دونوں طرح سے
تشنگی آغاز، اور انجام پانی
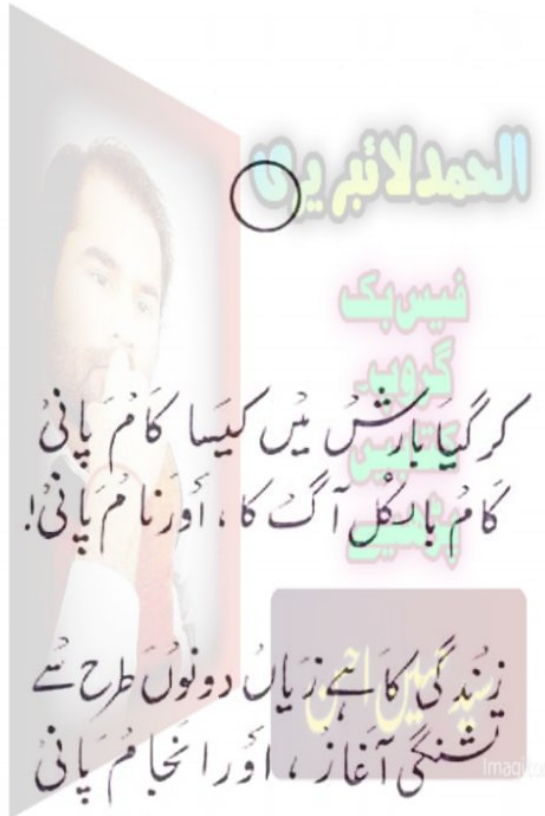
باقی موسم منہ چھپائے پھر رہے ہیں
پڑ رہا ہے خوب بے ہنگام پانی

سوکھتا رہتا ہے اک بے چارہ جنگل
نہریں بہتا ہے صبح و شام پانی

یُوں ہی بے منزل سا بہتا جا رہا ہے
کب ہے مثلِ گردشِ ایام پانی!

سرد وادی میں ہی رہتا برف بن کر
گرم میداں میں ہے بے آرام پانی!

یہ کیسا وقت مجھ پر آگیا ہے
سفر باقی ہے اور گھر آگیا ہے
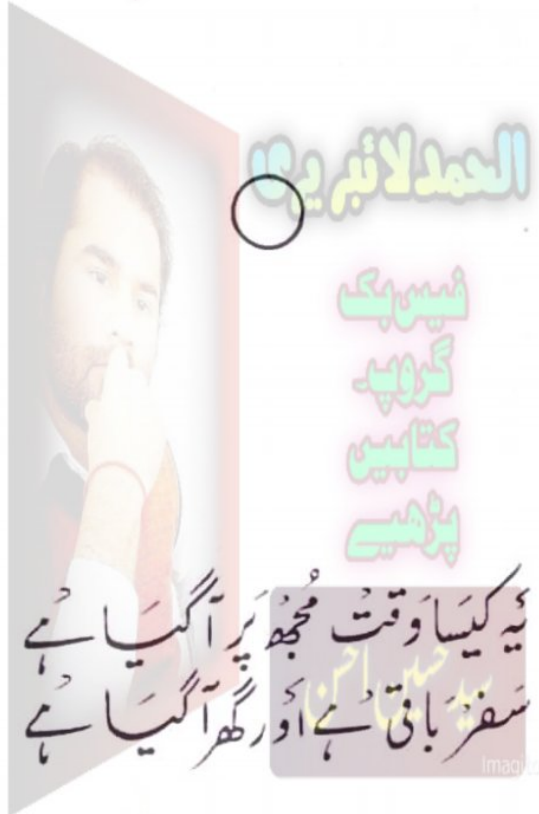
الٰہی خیر ہو بیمارِ غم کی!
مسیحا بھی دعا پر آگیا ہے

کچھ اُداسی سجا کے چہرے پر
اور باقی فضاؤں میں رکھنا
الحمد لائبریری
سید حسین احسن
Imagitor

شُجاع خاور

اور

"مِصرعِ ثانی"

پروفیسر محمّد حسن

ایک جملے میں کہنا ہو تو شُجاع خاور کی شاعری کو مانوس اجنبیتوں کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ مانوس جانا پہچانا لگے مگر شُجاع خاور کو کچھ ایسا گُر یاد ہے کہ یہی مانوس جانے پہچانے لفظ انوکھے بانکے ترچھے اجنبی سے ہو جاتے ہیں اور ان میں طرفگی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مانوس اجنبیتوں کے سہارے شاعر نے ست رنگی دنیا سجائی ہے۔

غزل میں یہ کام جتنا دشوار ہے وہ کچھ کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ ہر لفظ پر فرسودگی کی مُہر، ہر طرزِ ادا پر کسی اور کا اجارہ، ہر اندازِ بیان اس زمین کی مانند جسے زمیندار پہلے ہی اُٹھا چکے ہیں اور جس میں تردد بے جا لاحاصل ہے حتیٰ کہ محبوب کی ایک ایک ادا پر دو ڈھائی سو سال سے بڑے بڑے قادر الکلام اور صاحبِ طرز شاعر زورِ کلام صرف کر چکے ہیں۔ اِدھر دَورِ حاضر میں

تشبیہہ و استعارے کے کلاسیکی دروبست سے بچ کر نکلے تو نئے شاعروں کی برملا گوئی بھی اب کچھ نئی نہیں رہی، اور کچھ کھُردرے پن کچھ برجستگی میں بھی اب کچھ تازگی باقی نہیں رہی۔

ایسے میں سب سے بچ بچا کر اپنی نئی راہ نکال لینا بڑی جُرات کی بات ہے جس میں محض ہنرمندی کو دخل نہیں، احساس کی طرفگی اور شخصیت کے بانکپن کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کے کرارے پن کا بھی حصّہ ہے۔

شجاع خاور کو پڑھتے وقت بار بار میر کی شیوہ بیانی کا دھیان آتا ہے وہ میر نہیں جو شام ہی سے بجھے سے رہتے تھے بلکہ وہ میر جو خود اپنے کو بھی "اور بستی نہیں یہ دلّی ہے" کی یاد دہانی کرا کے اپنے کو دونوں ہاتھوں سے دستار تھامنے کی صلاح دیتے تھے۔ شجاع خاور کی خود کلامی افسُردگی اور اُداسی کی نہیں کچھ طنز اور شوخی کی ہے اور گو اس کا تخاطب شاعر کی ذات سے ہے مگر اس کی زد میں اس کا پورا دَور آ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پرانی دلّی کی کسی پرانی حویلی میں موسمِ سرما کی شام پڑ رہی ہے، یاروں کا مجمع ہے، قہوے کا دَور چل رہا ہے اور زمانے سنسار کی بات چل نکلی ہے۔ یاروں کی شکلیں سب ایک جیسی ہیں اور یہ شخصیتیں شجاع خاور ہی کے کئی رُوپ ہیں بیچ میں خود شاعر ہے جو کبھی اپنے پر کبھی دوسروں پر کبھی دَور پر پھبتی کستا طنز کرتا چلا جاتا ہے اور دُور آسمان پر ستارے خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہے ہیں، یہ چار یار نہ خود سے غافل ہیں نہ آسمان سے نہ ستاروں کی خاموش چال سے، مگر قلندری کی چادر اوڑھے، فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھے ہیں اور بقول انشا کسی اور ہی دھن میں بیٹھے ہیں۔ یہ گفتگو کا لہجہ، یہ شیوا بیانی، یہ تخاطب یہ دوستی کی گرمی یہ مشورے اور صلاح کا لہجہ، یہ زمانے کی اونچ نیچ سمجھنے سمجھانے کا انداز، سبھی اسی مجلسی رفاقت کی جھلکیاں ہیں جو تنہائی سے اُبھرتی ہیں اور اپنی شخصیت کو کئی شخصیتوں کے روپ میں ڈھال کر دیکھنے سے پیدا ہوتی ہیں:

مُنہ پر ہر ایک بات کو لاتا ہے کیوں شُجاع
دو ایک باتیں دل میں بھی بندۂ خُدا کے رکھ

○

گرمیوں میں اب کے ٹھنڈک ہے تو حیرت کس لیے
کس قدر گرمی تھی پچھلی سردیوں کی بات ہے

○

پرانے فن کے ماہر شہر میں پہلے ہی عنقا تھے
نئے فن کے بھی اب معقول کاریگر نہیں ملتے

○

آج بات خوشبو پر صاف صاف ہو جائے
اک طرف فقط وہ ہو اک طرف عدن سارا

○

ہر کس و ناکس کو زندہ کرنے والو
کیا مسیحائی کا دھندہ کر لیا ہے

○

یہ حقیقت بھی بڑی ظالم ہے بھائی
جرم خوابوں کا تھا، ہم کو دھر لیا ہے

○

ذرا سوچو تو تنہائی کا مطلب جان جاؤ گے
اگرچہ دیکھنے میں کوئی بھی تنہا نہیں لگتا

اس محفل میں پہلی بات چلی رفاقت کی، یا ہمی رشتوں اور تعلقات کی کہ ہمارے دور نے سب سے پہلے انھیں کو درہم برہم کیا ہے۔ نہ کوئی کسی کی بات سمجھے نہ کوئی کسی کو پہچانے۔ مگر خاور نے یہ شکوہ بھی قربت کے احساس اور بڑی محبتوں کے ساتھ مجلسی لہجے میں کیا ہے:

زباں کوئی بھی سمجھا نہ استعاروں کی
اسی لیے تو میاں اور دل جلا میرا!

○

مَیں دوستوں کی عنایت کی بات کیا چھیڑوں
کہ دشمنوں سے ہُوا کون سا بھلا میرا

○

بہت سے دوستوں کے جیسے گھر میں بیٹھے نظر آئے
بڑا اچھا رہا دشمن کے گھر کے سامنے رہنا

○

اوّل تو ہم اب کہتے نہیں کچھ بھی کسی سے
اور ہم نے کہا بھی تو یہاں کون سُنے گا

○

کچھ دوستوں کو پوچھتی پھرتی ہے پھر ہَوا
کہہ دو شجاعؔ چھوڑ چلے وہ تو کب کے ساتھ

○

گھر بھی محفل بھی بستی بھی
تنہائی کے نام بہت ہیں

○

تارے چاند سورج آسماں سب خیریت سے ہیں
وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا یہاں پر مر رہے ہیں لوگ

○

کبھی اظہار کی بے مائگی ایسی نہیں دیکھی
پریشاں گرچہ اس سے پہلے بھی اکثر رہے ہیں لوگ

کون آپ کی باتوں میں آئے گا شجاعؔ صاحب
اشعار سے کیا دُنیا بدلے گی ، اماں چھوڑو

○

شجاعؔ موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بڑا ضروری ہے

○

کہاں سے ابتدا کیجیے بڑی مشکل ہے درویشو
کہانی عمر بھر کی اور جلسہ رات بھر کا ہے

شعر کچھ زیادہ ہوگئے مگر ان سے شجاعؔ خاور کے لہجے اور تیور دونوں کا اندازہ ہوجائے گا۔ کہانی واقعی عمر بھر کی ہے اور درویشوں کا جلسہ صرف رات بھر کا ہے مگر اس کہانی پر درویشوں کے اسی رات بھر کے جلسے کا لہجہ اور فضا مستولی ہے جس نے شجاعؔ خاور کی شاعری کو بھی رنگ و آہنگ بخشا ہے اور تازگی عطا کی ہے۔

اس مجلسی لب و لہجہ میں مستی اور قلندری تو ہے ہی عشق و عاشقی کے رنگ ڈھنگ بھی ہیں، عشقیہ مضامین میں شجاعؔ نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے شاید فراق گورکھپوری کے بعد وہ تنہا غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے سیدھی سادی واردات کو کیفیت میں ڈھال دیا ہے، نہ روایتی محبوب کی جفا اور غمزۂ جاں ستاں کا ذکر نہ وہ تڑپ اور اضطراب کا تذکرہ جو راتوں کی نیند حرام کردے مگر ایک ایسی باوقار اور سنجیدہ دردمندی ضرور ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور جس کا والہانہ پن دلوں کو چھوتا ہے :

حالانکہ اس کے بعد ملاقات بھی ہوئی
دل سے تری جُدائی کا منظر نہیں گیا

○

Scanned with CamScanne

دُنیا کی بات چھوڑیے دُنیا تو غیر تھی
تم نے بھی کچھ خیال ہمارا نہیں کیا

○

خیر اس کی بے نیازی تو تسلیم ہے مگر
اس کے بغیر میں بھی کوئی مر نہیں گیا

○

تمھارا ذکر تو دو چار دن سے نکلا ہے
مرے دماغ میں ہے انتشار برسوں سے

○

بات سب ترکِ تعلق کی کیا کرتے ہیں
سوچتا کوئی نہیں ہے کہ یہ ہو گا کیسے

اور وہ نازک لطیف سا شعر :

نہ آئے کوئی تو لگتا ہے جیسے وہ نہیں آیا
وہ آجاتا ہے تو اندازہ ہی اس کا نہیں لگتا

یہ ایک ایسے شخص کا عشق ہے جو عشق کی کیفیات کو زندگی کے سبھی کیفیات اور جہات سے ملا کر دیکھتا، برتتا اور جھیلتا ہے نہ اسے کابوس کی طرح سر پر سوار کرتا ہے نہ اسے محض عیش و نشاط بناتا ہے بلکہ شخصیت کی واردات کا حصّہ سمجھ کر ذات میں اُتارتا جاتا ہے :

ہم اپنے آپ میں ہی رہتے مست وہ تو یوں کہو
وجود کا سرا ترے خیال میں اٹک گیا

اسی مستی کا ایک رُخ یہ بھی ہے :

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
مَیں بَد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

بلاشبہ شُجاع خاور نے ذاتی مسئلوں میں آفاقی مسئلے بھی ملائے ہیں، زمانے کے پست و بلند اور مصلحت پرستی سے دورِ حاضر میں اور خود اپنے ملک میں انسان کا قد جس طرح گھٹا ہے اور جس طرح وہ حق پرستی کے بجائے ذاتی نفع نقصان کے چکّر میں دل میں اُبلتے ہوئے طوفانوں کو لب پر مُہرِ سکوت یا منافقانہ قصیدہ خوانیوں کے ذریعہ انگیز کرنے کا عادی ہوتا جارہا ہے اس پر بڑی طنز بھری چوٹیں شُجاع خاور کے اشعار میں موجود ہیں مگر اپنی جیسے کوئی دوست جو خود بھی اس محفل میں شریک ہو، کسی ہم جلیس کی منافقت کی چوری پکڑ لے اور خاموشی سے چٹکی کاٹ لے :

اب یہ بھی قتل و خون کے بالکل خلاف ہیں
زندہ ہیں اپنے شہر کے جانباز، دیکھیے

○

کرتے رہتے ہیں سمندر کی قصیدہ خوانی
حشر میں خود کو بچائیں گے یہ دریا کیسے

○

کچھ شرم اب تجھے بھی تو آئے گی شاہِ وقت
لے ہم بھی آگئے ہیں تری بارگاہ میں

○

بعض جگہ اس طرزِ کلام نے بڑا لطف دیا ہے، اور شعر میں کچھ ایسی تہہ داری پیدا کر دی ہے کہ دیر تک سوچتے رہئیے اور لطف لیتے رہئیے بات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے :

دیکھئے تاثیر خالی زہر میں ہوتی نہیں
زندگی سوکھی ملا کر کھائیے گا زہر میں

○

فلسفے دھوپ ہیں، جلاتے ہیں
دل کو جذبوں کی چھاؤں میں رکھنا

○

کچھ نہیں ہوتا کتابوں پہ کتابیں لکھ دو
اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے

○

ذرا دیکھو کہانی میں بھی یہ منظر نہیں ملتے
بڑا انبار ہے جسموں کا لیکن سر نہیں ملتے

○

سبھی طوفان کی زد پر ہیں جب اور صاف ہے نقشہ
تو پھر کیا دیکھنا یارو ہوا کا رخ کدھر کا ہے

اس عجیب و غریب معاشرے کے عجیب و غریب بدلے ہوئے تیوروں نے جیسے سبھی باتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے جانے پہچانے راستے اور منزلیں بے معنی سی ہو گئی ہیں اور صحیح راستوں پر قدغنیں ہیں شاعر اسی الٹ پلٹ سے پریشان ہے کہ جن کے پاس تخیل ہے ان کی نظر کمزور ہے اور جن کی آنکھیں درست ہیں انھیں تخیل میسّر نہیں ہے۔ اسی لیے وہ ان کا راستہ کچھ اس طرح تجویز کرتا ہے کہ :

وہ راستے ملیں جو منزلوں سے بھی عظیم ہوں
کبھی اُٹھا کے دیکھیے تو ایک دو قدم غلط

○

امید کے سفر میں خیریت ہی خیریت ہے بس
اب اس سفر پہ روز کون جائے مَیں تو تھک گیا

اسی بھٹکنے والی راست گفتاری کا نام ہے شُجاع خَاور کی غزل جو دو چار قدم دوسروں کے نزدیک غلط چل کر بھی منزلوں سے عظیم تر راستوں کی طرف گامزن ہے۔ اس سفر میں دو کام شجاع خَاور کے جانے انجانے معرکے کے ہو گئے ہیں ایک یہ کہ موسموں کا اور زمین آسمان کا جو روپ اس شاعری میں ہے وہ خصوصیت سے توجہ کا طالب ہے اور موسم کے ایسے میش پا افتادہ عناصر جیسے ہوا، سورج، پانی، چاندنی وغیرہ عجیب و غریب معنویتیں اختیار کر گئے ہیں صرف لہجے اور فضا کی نہیں نت نئی علامتوں کی حیثیت سے بھی یہ جانے پہچانے الفاظ انوکھے ہو گئے ہیں بہت مانوس سے اجنبی مگر دل نواز اجنبی جنھیں ابھی دریافت کرنا باقی ہے اور جن کی شخصیت کا ہر گوشہ ابھی تک ہماری واقفیت کی گرفت میں نہیں آیا ہے۔ ثبوت کے لیے پانی، سورج، ہوا، پتھر ردیف والی غزلیں دیکھ ڈالیے یا پھر ان اشعار کو سامنے رکھیے جن میں ہَوا کا تذکرہ ہے اور کس کس زاویے سے ہے:

یہ تیز چلتی ہوئی ہوائیں یہ برف باری
پھر آج برباد کر دی یادوں نے شام ساری

○

موسم بدل جاتے ہیں خود ہی خود شُجاع
بس بیٹھے بیٹھے رُخ ہَوا کا دیکھیے

○

باقی موسم مُنہ چھپائے پھر رہے ہیں
پڑ رہا ہے خوب بے ہنگام پانی

اب یہاں 'ہوا' اور 'پانی' کی علامتوں میں کیسی کیسی بسیط حقیقتیں لپٹی ہُوئی ہیں ان کا بیان تحصیلِ لاحاصل ہے۔ وہ صرف مذاقِ سلیم کے سوچنے اور محسوس کرنے والی کیفیات کی نشان دہی کے لیے ہیں۔

آسمان بلکہ آسمان سے اُوپر عرش تک سے بھی شجاع خاور کا رشتہ کچھ اسی طرز کا ہے کہ زندگی پوری کائنات پر مستولی نظر آتی ہے اور اس کے در و بست کا کچھ حصّہ حضرت انسان کی خام کاریوں کی بھی نذر ہوا ہے اس کے روپ بہتیرے ہیں اور نت نئے ہیں مثلاً ایک تو وہی زمین اور اس کی وہ سرگرمیاں ہیں جنھیں ورڈز ورتھ نے THE WORLD IS TOO MUCH WITH US کہہ کے مطعون کیا تھا۔ شجاع خاور نے بڑے مزے میں کہا ہے:

زمیں اب چاندنی سے مجھ کو ملنے ہی نہیں دیتی
میں ہر شب جاگتا رہتا ہوں پر موقعہ نہیں لگتا

دوسری جہت اس کی وہ ہے جسے اقبال نے "کارِ جہاں دراز ہے" سے تعبیر کیا تھا:

فلک پر روز کوئی کام پڑ جاتا ہے دُنیا کا
جبھی تو رات کو ہم اپنے بستر پہ نہیں ملتے

○

سامان میرا عرش بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

عرش سے معاملت نئے طرز کی ہے اور شجاع خاور کے فکر و احساس کے کینوس کی وسعت کا پتہ دیتی ہے جس میں انسان محض ایک معاشرے کی چوحدی میں سکڑا ہوا فرد نہیں ہے بلکہ پورے کائناتی نظام کا ایک پرزہ (مہرہ یا اوزار) ہے اور وہ اپنے طور پر ہی سہی کائنات کی آرائش و زیبائش یا شکست و ریخت میں مبتلا ہے، نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

آخر میں شجاع خاور کی اس کاوش کا ذکر ضروری ہے کہ اردو غزل کو اس انداز بیان نے اکثر بیساکھیوں سے نجات دلائی ہے پڑھنے والے نئے ہوں یا پرانے، رجعت پسند ترقی پسند ہوں یا جدید یے، ان کو یہ ضرور احساس ہوگا کہ یہ شاعری کلیشے سے آزاد شاعری ہے نہ تو اس میں پیلا رہیت نیلا چیا ہر قسم کی مہملات ہیں نہ تشبیہ و استعارے کی مدد سے منظر آفرینی اور کیفیت آفرینی کی کوششیں ہیں نہ اس میں نئے پرانے کرتبوں سے قاری کو متاثر اور مرعوب کرنے کی خلش ہے بلکہ ایک خاص قسم کی راست گفتاری ہے۔ کھلے ڈلے پن سے اور صاف صاف سیدھے سادے ڈھنگ سے ہم جلیسی اور ہم نشینی کے طرز سے باتیں کہی گئی ہیں اور یہ شیوۂ گفتار دامن دل کو کھینچتا ہے۔

غزل میں سہلِ ممتنع کی شاعری کو اعلیٰ ترین سطح کی شاعری سمجھا جاتا رہا ہے اور سہلِ ممتنع کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے اور شعر میں نثر کا سا بلکہ بول چال کا سا در وبست قائم رہے، یہ ایسی خصوصیت ہے جو شجاع خاور کے کلام میں موجود ہے اردو غزل روایتی اندازِ بیان ہی کا نہیں روایتی لفظیات کا بھی شکار رہی ہے نئے برملا اور راست باز لفظوں کو جوں کا توں قبول کرنا غزل کے لیے خاصا مشکل مرحلہ رہا ہے۔ کھڑکی کو اردو غزل میں کھپانا مشکل ہے اسے دریچہ کہنا ضروری ہے۔ یہاں شجاع خاور نے اسے بولی ٹھولی کی میٹھاس نرمی اور برجستگی دینے کی کوشش کی ہے، 'چارپائی' اور 'بان' جیسے لفظ خوبی سے کھپ گئے ہیں۔

مگر اصل کارنامہ یہ ہے کہ اکثر اشعار تشبیہ و استعارے کی بیساکھی کے بغیر کھڑے ہیں اور اس کے باوصف دلوں میں کھبے جاتے ہیں، ان میں نہ فلسفے کی گرمی نہ سستے عشق کا نشہ نہ

جسم و جسمانیات، مگر احساسات کی رنگا رنگی اور طرزِ کلام کی شیوہ بیانی دل جیت لیتی ہے اور یہ اردو غزل کے لیے بھی فالِ نیک ہے اور شجاع خاور کے لیے بھی۔

اتنا سب کچھ لکھ لینے کے بعد شجاع خاور کی شاعری پر ایک بار پھر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی شعری کیفیت اب بھی گرفت میں نہیں آئی۔ ابھی کئی رنگینیاں ایسی ہیں جو اس شاعری کے پیرہن سے پھوٹ پڑتی ہیں مگر شاید ان کیفیات کو گرفت میں لانا پوری طرح ممکن بھی نہیں اور ممکن ہو بھی تو پڑھنے والوں کو خود اپنے کو ملبس اور خود اپنے رابن سن کروسو ہونے کی مسرت سے محروم کرنا بھی تو بے انصافی ہے۔

محمد حسن
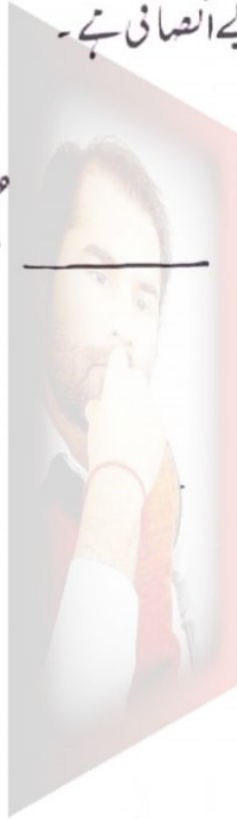
نئی دہلی
۱۸؍ دسمبر ۱۹۸۶ء

پُر امن زندگی نے بخشا شعور اچّھا
جو سامنے نہیں وہ دل سے بھی دور اچّھا

لفظوں کا بوجھ یارو جذبوں پہ کون ڈالے
جب کام چل رہا ہے بین السطور اچّھا

موضوعِ نظم کے ہیں چاروں طرف خدایا
کیوں دے دیا غزل پر ہم کو عبور اچّھا

تعریف اُس کی موزوں سارے جہاں کے آگے
شکوہ جہان بھر کا اس کے حضور اچّھا

آنکھوں کی قابلیت ہم خوب جانتے ہیں
لگتا ہے جو بُرا وہ ہوگا ضرور اچھا

باقی نہیں خدایا اظہار کی سکت بھی
جذبوں میں یہ اچانک آیا وفور اچھا

انداز میں تکلف باتوں میں بے رُخی تھی
پھر بھی شجاع خاور کچھ ہے ضرور اچھا

مِرے جذبات ظاہر کر رہے ہیں
تجھے بدنام شاعر کر رہے ہیں

تری شہرت کی خاطر کر رہے ہیں
تمنّا ہم ہی آخر کر رہے ہیں

مِری لاعلمیت کی خیر الٰہی
بڑے حملے مُفکّر کر رہے ہیں

پرندوں نے پکڑ لی ہیں زمینیں!
مگر پرواز طائر کر رہے ہیں
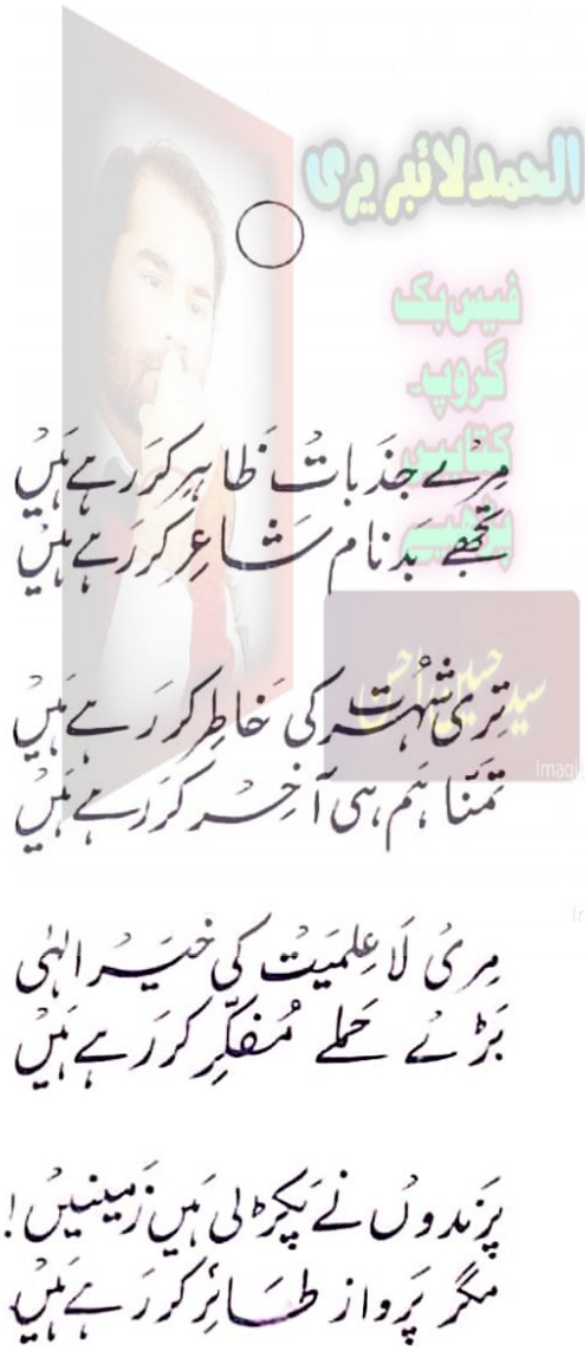
اَری منزِل کِدھر تُو جا چھُپی ہے
یہاں شِکوہ مُسافِر کر رہے ہیں

ہَمارا حَال مَت پُوچھو رَفیقو!
بہر حَال آرزُو پھِر کر رہے ہیں

شُجاع جو کام مَیں کرتا تھا پہلے
وہ اَب میرے مَعاصِر کر رہے ہیں

تخیّل شاعرانہ ہو گیا ہے
تمھیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے

ترا خط اور میرے نام آئے!
یہ قاصد بھی دِوانہ ہو گیا ہے

یہ وقت آنا ہی تھا ہم پر کسی دن
جنوں تو اک بہانہ ہو گیا ہے

رقیبوں سے تری تکرار کے بعد
ہمارا دوستانہ ہو گیا ہے

کیا فکر جو دشمن ہیں مرے یارِ غزل کے
مدّاح بھی بن جائیں گے دو چار غزل کے

اسلوب کے طوفان میں مضمون کی کشتی
اللہ اُتارے گا مجھے پار غزل کے

طوفان ہو سینے میں مگر لب پہ خموشی
حضرات یہی ہوتے ہیں آثار غزل کے

دُنیا کی عنایت ہو کہ ہو تیری نوازش
خالی نہیں جاتے ہیں کبھی وار غزل کے

دونوں میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے
ہوتے ہیں سخن فہم طرفدار غزل کے

الفاظ کے الفاظ معانی کے معانی
ہشیار بڑے ہوتے ہیں فن کار غزل کے

وہ میر کا اسلوب وہ غالب کا سلیقہ
پہلے نہ تھے انداز دل آزار غزل کے

وہ بحر و قوافی وہ ردیفیں وہ زمینیں
دلچسپ بڑے ہوتے ہیں کردار غزل کے

سو بار یہ سوچا کہ بس اب نظم لکھیں گے
چکر میں مگر آ گئے ہر بار غزل کے

بازار میں ہر شخص قصیدے کا طلب گار
ہم ہیں کہ لیے پھرتے ہیں اشعار غزل کے

○

○

حالات نہ بدلیں تو اسی بات پہ رونا
بدلیں، تو بدلتے ہوئے حالات پہ رونا

پڑ جائے گا تم کو بھی غمِ ذات پہ رونا
جس بات پہ ہنستے ہو اسی بات پہ رونا

اظہار میں قوت ہے تو مل جائے گا موضوع
سوکھا نہیں پڑتا ہے تو برسات پہ رونا

اس شہر میں سب ٹھیک ہے کیا سوچ رہے ہو
رونا ہے تو اپنے ہی خیالات پہ رونا

میں آپ کی اس سرد مزاجی پہ ہنسوں گا
اور آپ مری شدتِ جذبات پہ رونا

سارا ہی ستم گردشِ ایام کا نکلا
یہ مکتبۂ فکر بڑے کام کا نکلا

جو طنز کیا کرتا تھا ساقی کے چلن پر
وہ رند بھی محتاج بس اک جام کا نکلا

جو صبح کو بھٹکے تھے سرِ شام پلٹ آئے
لوٹا نہ مگر صبح تلک شام کا نکلا

کہتے تھے جسے لوگ ترے فن کا نمونہ
وہ شعر شجاعؔ حضرتِ الہام کا نکلا

یہ لفظ یہ لہجہ یہ زباں، کون سنے گا
کیوں دشت میں دیتے ہو اذاں کون سنے گا

موضوع بھی یوں کون سا اچھا ہے ہمارا
اور اس پہ یہ انداز، اماں کون سنے گا

ساری ہی زمیں پر ہے ستم کرب و بلا کا
اک میری شہادت کا بیاں کون سنے گا

اوّل تو ہم اب کہتے نہیں کچھ بھی کسی سے
اور ہم نے کہا بھی تو یہاں کون سنے گا

کیوں خواب سناتے ہو شجاع اپنے ہر اک کو
بیکار کی باتیں یہ میاں کون سنے گا

نادیدنی ہر بزم کا منظر ہے ـــ مگر دیکھ
تنہائی سے بچنا ہے تو یہ کام بھی کر دیکھ

ہوتا نہیں کچھ اپنی دعاؤں کا اثر ـــ دیکھ
جا آرزوئے وصل کوئی دوسرا گھر دیکھ

خاموشی اب اچھی نہیں اے لمحۂ اظہار
لے آگیا جذبات کی دیواریں در، دیکھ

دیکھا تو بہت کچھ ہے شجاع شہر میں تو نے
اِس شہر میں زندہ ہیں ہمارا بھی ہنر دیکھ

اِس سر کی ضرورت کبھی اُس سر کی ضرورت
پوری نہیں ہوتی مِرے پتّھر کی ضرورت

تخئیل کو ہر دم ترے پیکر کی ضرورت
مفلس کو رہے جیسے سدا زر کی ضرورت

بند آنکھیں کیے رہتے ہیں بینائیوں والے
دِکھتا ہو تو پھر کیا کسی منظر کی ضرورت

دل اوپری تسکین پہ راضی نہیں ہوتا
اور لوگ سمجھتے نہیں اندر کی ضرورت

ایمان بھی ہے ختمِ نبوت پہ ہمارا،
محسوس بھی کرتے ہیں پیمبر کی ضرورت

ویسے تو سبھی کچھ ہے مگر بہرِ نمائش
قطرے کو ہے بس ایک سمندر کی ضرورت

پھر دشت نوردی کا چلن عام ہُوا ہے
پھر ہوتی ہے محسوس ہمیں گھر کی ضرورت

اب کس کے وسائل ہیں کہاں تک یہ الگ ہے
اظہار کی سب کو ہے برابر کی ضرورت

دشمن کو شجاعؔ آپ کا اسلوب بہت ہے
برچھی کی ضرورت ہے نہ خنجر کی ضرورت

جذبے ہیں اور اظہار کا سامان نہیں ہے
اس طرح سے جینے میں کوئی شان نہیں ہے

قسمت کا بدلنا کوئی آسان نہیں ہے
فی الحال تو مرنے کا بھی امکان نہیں ہے

میرا تو چلو یہ ہے کہ پندار زدہ ہوں!
وہ خود تو مرے درد سے انجان نہیں ہے

موسم تو اشاروں میں بدل دیتے ہیں ہم لوگ
کچھ دن سے طبیعت ہی پریشان نہیں ہے

ہر شہر میں صحرا نظر آتا ہے شجاع کو
یعنی کہ یہ خود وحشی ہے، انسان نہیں ہے

○

میری خواہش بھی وہی ہے دل کی نادانی وہی ہے
آپ بھی بدلے نہیں ہیں وقت بھی یعنی وہی ہے

بڑھ رہی ہے دن بہ دن فرصت کے لمحوں کی گرانی
اور ماہ و سال کی پوچھو تو ارزانی وہی ہے

فکر تو بدلی ہے اپنی دوسروں کی ہم ہی ہیں
ہاں مگر اظہار کا انداز طوفانی وہی ہے

ایک دو چیزیں بچی ہیں اس تغیّر کی نظر سے
ہم وہی ہیں اور اک اپنی پریشانی وہی ہے

ذہن کو حالانکہ پختہ کر دیا ہے تجربوں نے
باوجود اس کے مری آنکھوں کی حیرانی وہی ہے

کیسے تنہائی کے ہاتھوں لُٹ گیا انسان دیکھو
آؤ میری چارپائی کا شکستہ بان دیکھو

عید کے جاتے ہی واپس آ گئے رمضان دیکھو
روزے دارو مُنہ نہ کھولو بس خدا کی شان دیکھو

نارسی اپنی جگہ ہے، دیکھ لینا کیا بُرا ہے
آرزو کے شہر میں پھیلا ہُوا سامان دیکھو

ڈوبنے سے پہلے موجوں میں گھرے اچھے لگو گے
یوں بھی آئے گا کناروں تک یہی بحران دیکھو

اک تحفّظ سا ہے ان مایوسیوں کی ہمرہی میں
پڑ نہ جائے راستے میں پھر کوئی امکان دیکھو

اس طرح خوابوں سے رشتہ توڑنا اچھا نہیں تھا
ہو گئیں پھر بستیاں کی بستیاں ویران دیکھو

کب تلک خود ہی نکالو گے شجاع اچھی زمینیں
ایک دن تم بھی کسی استاد کا دیوان دیکھو

متفرقات

نثر میں ہاتھ حریفوں کے جو لمبے ہیں تو کیا
شعر میں رکھتے ہیں ہم بھی یدِ طولیٰ، لکھو

ایک ہی شعر میں آورد بھی ہو آمد بھی
مصرعِ ثانی کہو — مصرع اولیٰ لکھو

لوگ خوش ہیں اور ہم کو ذات کا غم ہو رہا ہے
دن بہ دن دنیا سے اپنا رابطہ کم ہو رہا ہے

وہ سمجھ لے جو سمجھ سکتا ہے ہم پھر کہہ رہے ہیں
کربلا میں آج کل جشنِ محرّم ہو رہا ہے

اِس طرف حالات کے حربے برابر بڑھ رہے ہیں
اُس طرف یادوں کا دستہ پھر منظم ہو رہا ہے

ہم بزعمِ خود بہت برہم زمانے سے ہیں لیکن
لوگ کہتے ہیں زمانہ ہم سے برہم ہو رہا ہے

جانے کب بدلے گا یہ منظر جہانِ آرزو کا
حادثہ ہونے سے پہلے اتنا ماتم ہو رہا ہے

○

ہر طرف سے اس رویّے کی بُرائی ہو رہی ہے
پھر بھی دُنیا میں ابھی تک بے وفائی ہو رہی ہے

گرم لفظوں اور سرد آہوں پہ مرتا ہے زمانہ
درد کے بازار میں اچھی کمائی ہو رہی ہے

دیکھنے والوں میں بالکل بھی نہیں ہے بے نیازی
اس لیے چلمن کے پیچھے سے خدائی ہو رہی ہے

سب یہ کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی گویا یہی تھا
داد کے پردے میں کیسی خودستائی ہو رہی ہے

شہر والے ٹھیک ہیں اپنی شجاعؔ صاحب سناؤ
فلسفوں کی قید سے کب تک رہائی ہو رہی ہے

○

جنوں ہے نیکی اور اُس کا ثواب تنہائی
خرد گناہ، اور اُس کا عذاب تنہائی

ہر ایک روز ہے روشن ہر ایک شب اُجلی
کبھی قمر تو کبھی آفتاب تنہائی

رفیق چاروں سرِ شام آ نکلتے ہیں
ترا خیال، تفکر، شراب تنہائی

پھر آج شام کو گھر لوٹ کر ہم آئیں گے
ملے گی پھر وہی خانہ خراب تنہائی

شجاعؔ اس کو سمجھتے ہیں آپ ہی ورنہ
کسے نصیب نہیں ہے جناب تنہائی

یہی تو رکھتی ہے پہچان خاص تنہائی
کہ بزم بزم سے ملے گی اداس تنہائی

بجھا سکی نہ کہیں اپنی پیاس تنہائی
تمام رات رہی میرے پاس تنہائی

ہمیں تو خیر سے ہے یوں بھی راس تنہائی
اسے نہ کر دے کہیں بدحواس تنہائی

تصورات پہ قابو ہمیں نہیں رہتا
اتارتی ہے جب اپنا لباس تنہائی

میاں شجاع یہ خاموشی تھوڑی دیر کی ہے
ابھی سنائے گی قصے پچاس تنہائی

○

سمجھ سکے نہ یہ شاعر ادیبِ تنہائی
میانِ وجود ہے عیسیٰ، صلیبِ تنہائی

مزاج رکھتی ہے کیسا عجیب تنہائی
مری حبیب تو تیری رقیب تنہائی

کہیں پہ بزم کا نقشہ بڑا بھیانک ہے
کسی کو گھر میں ڈرائے مہیب تنہائی

تمام شہر میں اپنے ہمیں نظر آئے
پڑی ہے گھر پہ ہمارے غریب تنہائی

عقب میں اس کے خیالوں کا قافلہ ہے شجاع
ہجومِ غم کی ہے گویا نقیب تنہائی!

○

نکال ذات ہے باہر نکال تنہائی
کمال جب ہے کہ شعروں میں ڈال تنہائی

عذابِ جاں بھی جہاں میں نہیں کوئی ایسا
رفیق بھی ہے بڑی بے مثال تنہائی

تمام زندگی دو واقعات ہیں یوں ہے
عروج اس کی رفاقت زوال تنہائی

کوئی بھی وقت ہو تیرا ہی ذکر کرتی ہے
کبھی تو پوچھے ہمارا بھی حال تنہائی

اگرچہ شہر میں بکھری ہے جا بجا، پھر بھی
شجاع اپنے لیے گھر میں پال تنہائی

○

نفس نفس کے ہوئی آر پار تنہائی
اکیلا دیکھ کے کر بیٹھی وار تنہائی

یہ دشتِ دشتِ سکوں غار غار تنہائی
چلا رہی ہے بڑا کاروبار تنہائی

ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے
ہوئی ہے ذہن پہ جب سے سوار تنہائی

جہاں پہ سلسلہ بنتا ہے کچھ رفاقت کا
نکالتی ہے وہیں آر جار تنہائی

یہی نماز شجاعؔ کی ہے اور یہی روزہ
قبول کر مرے پروردگار تنہائی

○

شکم کے جبر سے مولا بس اب رہائی دے
قصیدہ جس پہ نہ لکھوں وہی برائی دے

نہ ہو نمود تو جوہر بھی کیا دکھائی دے
قلم وہی ہے خدا جس کو روشنائی دے

خموشیوں نے سماعت کو کر دیا بے کار
سکوت چیخ رہا ہو تو کیا سنائی دے

ہمیں بھی کون سی رغبت ہے ایسی دنیا سے
مگر فرار کا رستہ بھی تو دکھائی دے

مرے عقیدے ہوئے ختم اور ترا اعجاز
میں مر نہ جاؤں مسیحا، کوئی دوائی دے

شروع میں تو تھا مشہور ولولہ میرا
پھر اِس کے بعد پتہ بھی نہیں چلا میرا

زباں کوئی بھی سمجھا نہ استعاروں کی
اِسی لیے تو میاں اور دِل جلا میرا

چند ایک خواب ہی باقی ہیں، باقی ٹوٹ چکے
اب ایسا کون سا مشکل ہے مسئلہ میرا

میں دوستوں کی عنایت کی بات کیا چھیڑوں
کہ دشمنوں سے ہوا کون سا بھلا میرا!

سکوتِ دشت کو توڑے بغیر آتا ہے
مزاج خوب سمجھتا ہے زلزلہ میرا

گزر بسر کے لیے ہو گیا ہوں چپ ورنہ
بیانِ درد ہے محبوب مشغلہ میرا

قلم نے خوب غزل گوئی کی شجاع مگر
غزل سرائی نہیں کر سکا گلا میرا

متفرقات

شہرِ تغافل ہیں یہ توجہ اور کہیں کیا پائیں گے ہم
آپ نہ ہوں تو اتنا سارا درد کہاں سے لائیں گے ہم

خوشی کے نغمے لکھنے والے بستی کب کی چھوڑ چکے ہیں
سوچ رہے ہیں موسم اچھا آیا تو کیا گائیں گے ہم

عُروج ہی میں نہیں ہے کمال سُورج کا
زوال بھی ہے بڑا بے مثال سُورج کا

کُچھ ایسا ذہن پہ چھایا جلال سُورج کا
کہ چاند پر بھی ہُوا احتمال سُورج کا
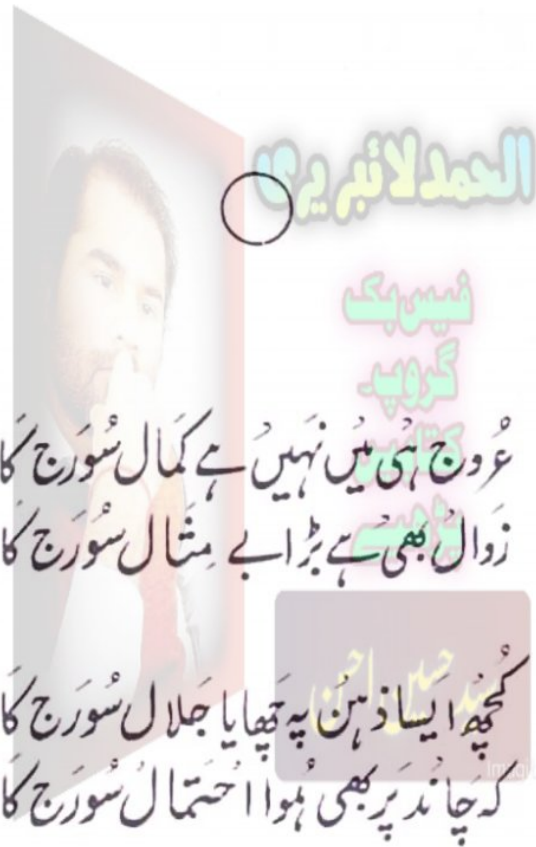
زمین لُوٹ چکی سارا مال سُورج کا
پھر آسمان پہ پڑتا ہے کال سُورج کا

طلوع میں ہی نہاں ہے مآل سُورج کا
اگرچہ شام کو پُوچھوں گا حال سُورج کا

اُمیدیں چاند کے ہمراہ ڈوب جائیں گی
سحر پھر آ کے بچھا دے گی جال سورج کا

دہکتے دن کو خنک چاندنی سے اُمیدیں
اندھیری رات کے دل میں خیال سورج کا

گزارنا ہے ہر اک دن اسی زمیں پہ شجاعؔ
بس اب دماغ سے خدشہ نکال سورج کا

تکلفات کی منزل عبور کی جائے
وصال ہو نہ ہو خواہش ضرور کی جائے

شکایت اس کی ہوا اور آسمان پہ رکھ کر
کسی بہانے سے اس کے حضور کی جائے

بڑی طویل ہے تیرے خیال کی سرحد
شبِ فراق میں کیسے عبور کی جائے
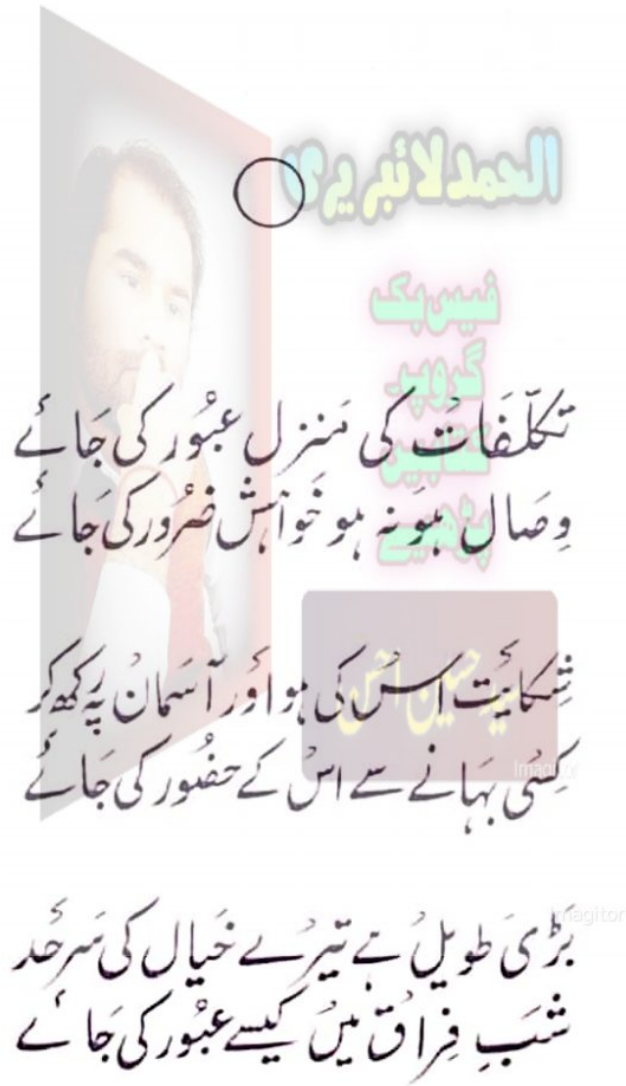
نظارے کم ہوں تو شکوہ کریں کسی سے شجاعؔ
میاں نظر کی کمی کیسے دور کی جائے

بھلی ردیف کوئی قافیہ حسین کوئی
نئی غزل ہے نکالو نئی زمین کوئی

نہ دل گداز کوئی اور نہ دل نشین کوئی
کہے بھی کیا مرے شعروں پہ آفرین کوئی

مثال کیسے دوں تیری طرح حسین کوئی
مرے بیان پہ کرتا نہیں یقین کوئی

خرابیِ خانۂ دل کی شجاع کیسے نہ ہو
میاں مکان کسی کا ہے اور مکین کوئی

○

اِسی غریب پہ غصّہ اُتار لیتے ہیں
چلو پھر آج نفس کو ہی مار لیتے ہیں

شعورِ ذات سے عاری عجیب لوگ ہیں یہ
جو کائنات کے گیسو سنوار لیتے ہیں

ہوا اُمید کی اُور فلسفوں کا بستر ہے
چلو یہیں پہ شبِ غم گزار لیتے ہیں

ہمارا کیا ہے قلم کے سوا، اسی کے طفیل
ہر اک قسم کے جذبات ابھار لیتے ہیں

ہجوم ہو تو ہمیں اپنی ذات کافی ہے
اکیلے ہوں تو خدا کو پکار لیتے ہیں

○

سکوں زمینِ قناعت پہ جب نظر آیا
تو آرزو کی بلندی سے میں اُتر آیا

ہجومِ فکر میں تیرا خیال در آیا
کوئی تو آشنا اس بھیڑ میں نظر آیا

رقیب میرے خلاف اُس کے کان بھر آیا
جو اِس غریب کے بس کا تھا کام، کر آیا

حیات و موت کی کچھ ساز باز لگتی ہے
ترا خیال گیا اور چارہ گر آیا

دل و دماغ کی سب نفرتیں برہنہ تھیں
اچانک آج جو دشمن ہمارے گھر آیا

جو ہم سے ہو گا وہ ہم بھی ضرور کر لیں گے
اگر بہار کا موسم شباب پر آیا!

وہ جس سے پورا تعارف بھی ہو نہ پایا تھا
وہ ایک شخص ہمیں یاد عمر بھر آیا!

ترے قصیدے سے اس کا بھلا تو کیا ہوتا
شجاع کچھ ترا اسلوب ہی نکھر آیا

متفرقات

فلسفے دھوپ ہیں، جلاتے ہیں
دل کو جذبوں کی چھاؤں میں رکھنا

کچھ اداسی سجانا چہرے پر
اور باقی فضاؤں میں رکھنا

○

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے
پکارنے کے لیے اک خدا ضروری ہے

ہزار رنگ میں ممکن ہے درد کا اظہار
ترے فراق میں مرنا ہی کیا ضروری ہے

شعور شہر کے حالات کا نہیں سب کو
بیان شہر کے حالات کا ضروری ہے

کچھ ایسے شعر ہیں یارو جو ہم نہیں کہتے
ہر ایک بات کا اظہار کیا ضروری ہے

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا، بڑا ضروری ہے

ادب میں جو اسلوب چلتا نہیں ہے
تری مدح میں ہو تو کھلتا نہیں ہے

سفر پر مرے ساتھ چلتا نہیں ہے
کوئی گھر سے باہر نکلتا نہیں ہے

وہی آج بھی ہے اداسی جو کل تھی
عجب ہے یہ موسم بدلتا نہیں ہے

کدھر تیرا رجحان ہے تو ہی جانے
مگر غیر اب ہم سے جلتا نہیں ہے

میں جس کے لیے شاعری کر رہا ہوں
وہی شعر لفظوں میں ڈھلتا نہیں ہے

Scanned with CamScanner

○

اُڑا کیا جو رُخ پر ہَوا کے اُڑا
کہ اس سے تو اچھا ہوں میں بے اُڑا

کسی دن اچانک قریب آ کے تو
تصور کے میرے پرَ نچے اُڑا

ابھی تک نظر میں ہے اپنا وجود
تخیّل! ذرا اور اونچے اُڑا

جسے سب سمجھتے تھے بے بال و پر
وہی اک پرندہ قفس لے اُڑا

شجاع آندھیوں کی کرو فکر تم
وہ آئی سحر اور میں یہ اُڑا

خواب اتنے ہیں یہی بیچا کریں
اور کیا اس شہر میں دھندہ کریں

کیوں کسی کا نام ہم رسوا کریں
استعاروں کی زباں بولا کریں

کیا ذرا سی بات کا شکوہ کریں
شکریے سے اُس کو شرمندہ کریں

تو کہ ہم سے بھی نہ بولے ایک لفظ
اور ہم سب سے ترا چرچا کریں

سب کے چہرے ایک جیسے ہیں تو کیا
آپ میرے غم کا اندازہ کریں

خواب اُدھر ہے اور حقیقت ہے اِدھر
بیچ میں ہم پھنس گئے ہیں کیا کریں

ہر کوئی بیٹھا ہے لفظوں پر سوار
ہم ہی کیوں مفہوم کا پیچھا کریں

مری آرزو کی بلندیوں سے زمیں کو دیکھو تو ڈر لگے
بڑی احتیاط سے اُڑ رہا ہوں کہ آسماں سے نہ سر لگے

ترے لفظ لفظ میں نعمتیں مرے خواب خواب میں نعمتیں
اِنہی التفات کو دیکھ کر مری خواہشوں کو بھی پر لگے

کوئی چشم و لب کا شہید ہے کوئی شخصیت کا مرید ہے
ہمیں شہر بھر کا پتہ رہے اُسے اپنی بھی نہ خبر لگے

یہ قلم کا کھیل ہے پُرخطر کوئی ایسا کام شجاع کر
کہ نہ دولتِ غمِ دل لٹے نہ متاعِ سوزِ جگر لگے

○

اور اک حشر سرِ شام بپا کون کرے
خامشی چیخ رہی ہو تو صدا کون کرے

لوگ اچھی طرح ہم سے ہی کہاں واقف ہیں
اس کے برتاؤ کا لوگوں سے گِلہ کون کرے

اِن دِنوں جبر بہت تازہ مضامین کا ہے
چاہتے سب ہیں مگر ذکر ترا کون کرے

کیا مزے دار خیال آتے ہیں دل میں، لیکن
ان خیالات کا اظہار کیا کون کرے

اب تو تیرا ہی سہارا ہے اُمیدِ فردا
کام میرا ہو تو پھر تیرے سوا کون کرے

○

رُوبرو حُسن کے اِن الفاظ کا ڈر بیٹھ گیا
دِل کسی طور سنبھالا تو جگر بیٹھ گیا

ہم بہت خوش تھے کہ بارش کے بھی دِن بیت گئے
دھوپ دو روز پڑی ایسی کہ گھر بیٹھ گیا

اُس پری وش کا بیاں چھڑتے زباں پر میری
رازداں آج مرا جا کے کدھر بیٹھ گیا

کر دیا سوچ نے ترتیب کو درہم برہم
یوں سمجھ لو کہ پرندے پہ شجر بیٹھ گیا

میرے اظہار سے اُس کو تو بدلنا کیا تھا
اُس کی خاموشی کا خود مجھ پہ اثر بیٹھ گیا

○

سیکھ لیں ہم سے ترے عارض و لب کی باتیں
آج کل غیر بھی کرتا ہے غضب کی باتیں

وصل کی رات میں بھی ہجر کی شب کی باتیں
ہم بھی کس وقت سنانے لگے کب کی باتیں

کیا سناتے ہو مجھے شعر و ادب کی باتیں
دوست تو خوب سمجھتا ہوں میں سب کی باتیں

گویا سب قصے دن کے جو کہتے مثنوی تھے
کون مانے گا میاں نالۂ شب کی باتیں

سیکھ لو کام گزارے کے لیے کوئی شجاع
کچھ نہیں دیں گی میاں شعر و ادب کی باتیں

ایسے حالات میں کر بیٹھے تمنا کیسے
دِل کے ماروں نے جِگرا اتنا دِکھایا کیسے

بات سب ترکِ تعلق کی کیا کرتے ہیں
سوچتا کوئی نہیں ہے کہ یہ ہوگا کیسے

جیسے موضوع بدل دیتا ہے تو روز کے روز
اپنے اسلوب کو بدلوں میں خدایا کیسے

گھر سے باہر کھلے میدان میں آ کر دیکھو
رخ بدل جاتا ہے پل بھر میں ہوا کا کیسے

ایک منظر بھی حقیقی نہیں لگتا یارو
ایسے دیکھے گا کوئی روز تماشا کیسے

اجتناب اس نے کیا بعد میں، حیرت یہ ہے
اس قدر بھیڑ میں اس نے مجھے دیکھا کیسے!

التفات اس کا بہشت اور تغافل دوزخ
صرف اک شخص بدل دیتا ہے دنیا کیسے!

کرتے کرتے ہم افاعیل غزل کہنے لگے
عقل کے عیب کو جذبوں نے چھپایا کیسے!

کرتے رہتے ہیں سمندر کی قصیدہ خوانی
حشر میں خود کو بچائیں گے یہ دریا کیسے

میرا اسلوب نہ موضوع نہ ہیئت نہ مواد
اس لیے کوئی مری بات سمجھتا کیسے

ہم تو ویسے بھی اکیلے تھے مگر یہ دیکھو
مجلسی لوگ بھی مارے گئے تنہا کیسے

ذکر کیوں کرنے لگے آپ تیمّم کا شجاع
لبِ دریا یہ خیال آپ کو آیا کیسے

متفرق

تمہارا ذکر تو دو چار دن سے نکلا ہے
مرے دماغ میں ہے انتشار برسوں سے

جسم کی قید سے بندے کو رہائی دے گا
بندگی بھا گئی اُس کو تو خدائی دے گا

ایک دن ہم ترے لہجے میں کریں گے باتیں
اور تو دیرینہ تعلق کی دہائی دے گا

جا شبِ ہجر تجھے دے دیے دونوں آنسو
کون اِس طرح سے برسوں کی کمائی دے گا

اپنے آنگن میں کڑی دھوپ ہے مایوسی کی
چاند اب غیب کے آنگن میں دکھائی دے گا

○

غور اس پر نہیں کرتا ہے کوئی شاعر کیوں
اب زمیں پر ہی نظر آتا ہے ہر طائر کیوں

سب سے بیزار ہوں اک آدمی کی خاطر کیوں
بھول سکتا نہیں اس شخص کو میں آخر کیوں

چلو ہم کو تو نہیں علم و ہنر سے نسبت
جن کو نسبت ہے وہ اظہار سے ہیں قاصر کیوں

ہم بھی بس عظمتِ انسان کا دم بھرتے رہیں
دل کے جذبات زمانے پہ کریں ظاہر کیوں

اس کی پرواہ بھی ہم تو نہیں کرتے ہیں شجاع
فکر کرتا ہے ہماری یہ زمانہ پھر کیوں!

اب بھی لگتا ہے ہمیں ہاتھ میں کاسہ اچّھا
یعنی چھوڑا ہے بزرگوں نے اثاثہ اچّھا

نہ دوا اب ہے مناسب نہ دلاسہ اچّھا
کام کر دے گا مرا درد ہی خاصہ اچّھا

شخصیت اپنی ابھرتی ہے اسی پہلو سے
تو سمندر ہے تو یہ بندہ پیاسا اچّھا

ایسی کچھ رائے نہیں رکھتے ہم ان چیزوں پر
اس کا چہرہ ہو تو لگتا ہے مہاسہ اچّھا

ساتھ ہیں سارا زمانہ ہے تو کِس کام کا ہے
اُتنے لوگوں سے میاں ایک شناسا اچھّا

ہم بھی لکھیں گے تِرے حُسن کے موضوع پہ کُچھ
اور ہو جائے جو اسلُوب ذرا سا اچھا

مُتفرقات

اشعار میں کیا ذِکر کروں تیرے بدن کا
اشعار تو اوروں کو سنانے کے لیے ہیں

مفہوم مرے شعر کا الفاظ سے مت پُوچھ
الفاظ تو مفہوم چُھپانے کے لیے ہیں

○

اس کے مفہوم پہ کچھ ہم ہی نظر رکھتے تھے
یوں تو رکھنے کو سبھی دردِ جگر رکھتے تھے

آپ جذبات چھپانے کا ہنر رکھتے ہیں
ہم بھی جذبات چھپانے کا ہنر رکھتے تھے

ہم پہ وہ وقت بھی گزرا ہے کہ نیند آتی نہ تھی
درد کی گود میں جب تک کہ نہ سر رکھتے تھے

اب تو خیر اپنی طبیعت کا بھی معلوم نہیں
پہلے ہم سارے زمانے کی خبر رکھتے تھے

کچھ نہیں ہوتا، کتابوں پہ کتابیں لکھ دو!
اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے

درد کا سلسلہ بھی جاری ہے
چارہ گر کا بھی خوف طاری ہے

فرد ہلکا وجود بھاری ہے
ایک مصرع میں بات ساری ہے

آرزوؤں سے خوب یاری ہے
کائنات اِن دِنوں ہماری ہے

فلسفی اپنی راہ لے چپ چاپ
ہم نے خود زِندگی گزاری ہے

خوب بکتا ہے روز مال اس کا
وقت خوابوں کا بیوپاری ہے

ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے میاں
شاعری صرف شعر کاری ہے

متفرقات

عقل میں بھی رہے کم تر دلِ نادان سے ہم
درد کو دل سے نکالا تو گئے جان سے ہم

اس کے آگے نہ شکایت نہ حکایت نہ دلیل
گفتگو اوروں سے کرتے ہیں بڑی شان سے ہم

غم کے جنگل میں ایک باغ لگا
دل بھی لگ جائے گا، دماغ لگا

چل دیے ہم فنا کے رستے پر
رہ گیا خواہشوں کا باغ لگا

ہم بھی نادم ہوئے وفا پہ تری
تیرے کردار کو بھی داغ لگا

فارسی پڑھ گئے شجاع جو ہم
ہر پیالہ ہمیں ایاغ لگا

○

جیسا منظر ملے گوارا کر
تبصرے چھوڑ دے نظارا کر

اب تو جینے کی آرزو بھی نہیں
چارہ گر اب تو کوئی چارہ کر

وصل کس کو نصیب ہوتا ہے
داغ کے شعر پر گزارا کر
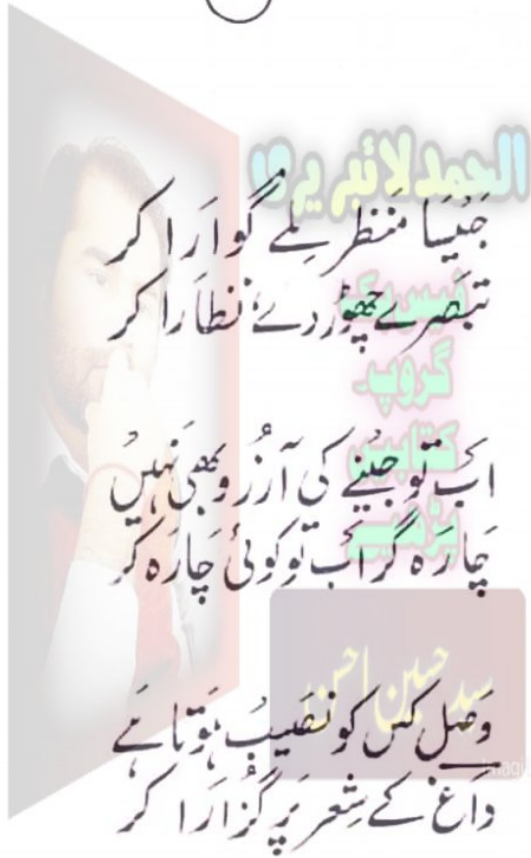
دوستوں کو خدا ہدایت دے
دشمنوں سے مگر کنارہ کر

سب کے جذبات سے تجھے کیا ہے
اپنے جذبات کو ابھارا کر

زمیں کا سلسلہ صرف آسماں تک ہے
اُداسی کیا کہا جائے کہاں تک ہے

یہاں سے لے کے اندازاً وہاں تک ہے
اکیلا پن مکاں سے لامکاں تک ہے

بڑا آرام ہے اس شہر کے باہر
تمنا کا علاقہ شہرِ جاں تک ہے

کہاں کی بزم اور کیا بزم آرائی
ہر اک رشتہ مری شیریں زباں تک ہے
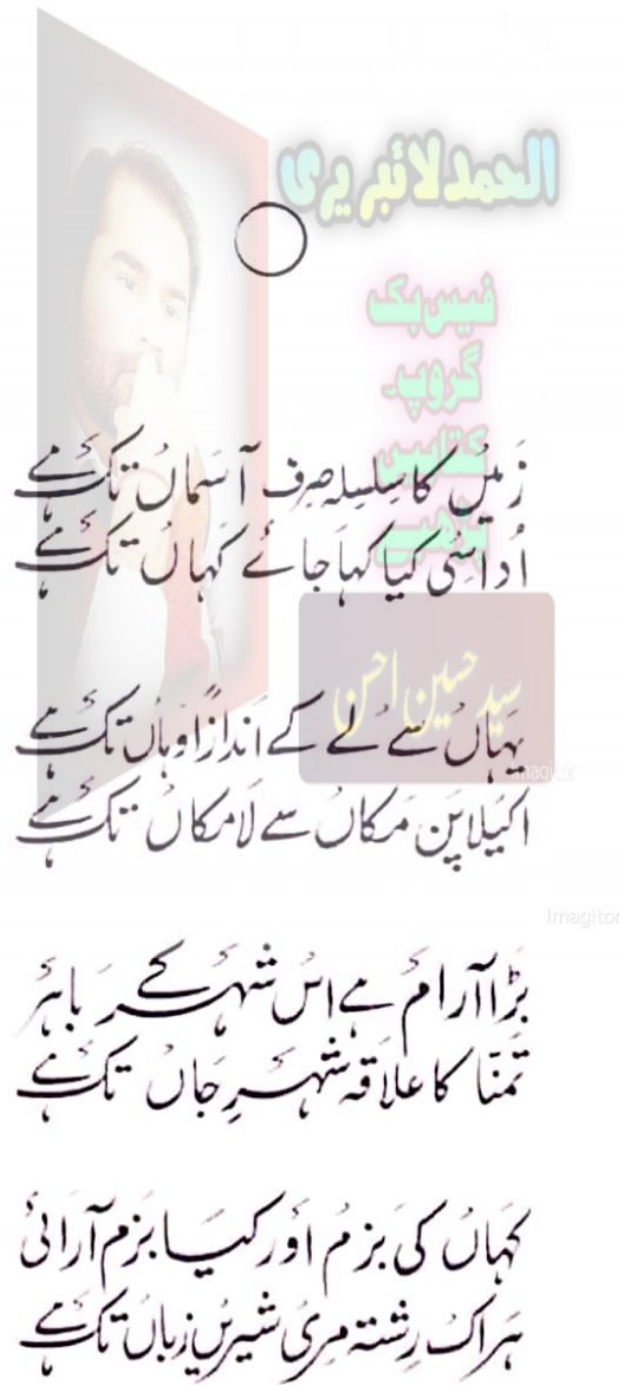
مکاں پر منحصر ہوتا نہیں یہ سب
بیابانِ وحشتِ آوارگاں تک ہے

ذرا محتاط ہو کر گفتگو کرنا
ہمارا سلسلہ اللہ میاں تک ہے

متفرقات

یہ جادو توڑنے کے لیے کچھ شگون کر
اللہ کو پکار، مسیحا کا خون کر

جینا ہے تو جنوں کا تلفظ جنون کر
دم گھٹ نہ جائے زور سے اعلانِ نون کر

ساری ہی زمیں پہ ہے ستم کرب و بلا کا
اک میری شہادت کا بیاں کون سنے گا
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن

ہُوا تو ہے عُدو کا کچھ دَباؤ کم
پَر اَب بھی ہے مِری جانب جُھکاؤ کم

حوالہ دُو سمندر کی خموشی کا
ندی شاید کرے اپنا بہاؤ کم

اُسے چھوڑو زمانے سے ہی مل آؤ
کرو تو شخصیت کا کچھ تناؤ کم

کرو کچھ استفادہ دوسروں سے بھی
بیانِ غم سُنو زیادہ سُناؤ کم

طبیعت اور اُلجھتی ہے حقیقت سے
اب اپنے خواب خود کو بھی بتاؤ کم

لگی اندر کی جب تیزی سے بڑھتی ہے
تو ہو جاتا ہے باہر سے لگاؤ کم

توجہ ان کہی نظموں پہ زیادہ ہے
جبھی اپنی غزل پر ہے رچاؤ کم

متفرقات

اُڑان کا شوق ہے تو اپنے گھروں سے بچنا
گھروں میں رہنا ہے تو پرندوں پروں سے بچنا

بھلو گے پھولو گے تم ہی دُنیا میں کور چشمو!
مگر جہاں تک ہو پھر کبھی دیدہ وروں سے بچنا

○

آنے والے کل کی باتیں
جنگل میں منگل کی باتیں

ہجر کی شب میں کون سنے گا
صبر کے میٹھے پھل کی باتیں

دل کہتا ہے دنیا چھوڑو
دیکھو اس پاگل کی باتیں

ہم سنجیدہ ہو جاتے ہیں
کرو نہ اس چنچل کی باتیں

موسم بدلا تو یاد آئیں
دھرتی کو بادل کی باتیں

آج تو کوئی آس نہیں ہے
چھوڑو یارو کل کی باتیں

چاند اس کے آگے کیا شے ہے
کیوں کرتے ہو ہلکی باتیں

سونے چاندی بھی کرتے ہیں
تانبے اور پیتل کی باتیں

ہم بھی شجاعؔ اب کر لیتے ہیں
بیٹھے بن کر چھل کی باتیں!

○

میرے چرچے عام بہت ہیں
تیرے سر الزام بہت ہیں

گھر بھی محفل بھی بستی بھی
تنہائی کے نام بہت ہیں

لاوارث پھرتی ہے رباعی
اور عمر خیام بہت ہیں

اندر اندر بے کاری ہے
باہر باہر کام بہت ہیں

کون شجاع اب لائے فلک سے
اپنے ہی پیغام بہت ہیں

○

شہر ایک ہی مسئلہ دوستو
کربلا، کربلا، کربلا دوستو

کچھ پتہ بھی نہ تم کو چلا دوستو
آکے تھم بھی گیا زلزلہ دوستو

تم زمیں کی نگاہوں سے بھی بچ گئے
میں فلک کو بھی کتنا کھلا دوستو

ہو اگر تم شبستاں شبستاں تو کیا
میں بھی ہوں کربلا کربلا دوستو

شعر در شعر اک پل صراطِ غزل
قافیہ قافیہ مرحلہ دوستو

جو گزر جائے دن اب وہی ٹھیک ہے
اس خدائی میں بس بندگی ٹھیک ہے

زیست بے آرزو کون سی ٹھیک ہے
اور ہے بھی تو کس کام کی ٹھیک ہے

سوچنا ہو تو بس سوچیے عمر بھر
دیکھنے میں تو ہر آدمی ٹھیک ہے

شب کو سورج چڑھے دن میں تارے رہیں
آج کل وقت کا بھی کوئی ٹھیک ہے

اب فلک دیکھتا ہی نہیں اس طرف
یہ رویّہ نیا اور بھی ٹھیک ہے

کچھ نہ کہنا ہو تو لفظ ہی لفظ ہیں
اور کہنا ہو تو خامشی ٹھیک ہے

شاعری کی تمھیں فکر کیوں ہے شجاع
ہو گئی جو بھی اچھی بری ٹھیک ہے

متفرقات

جمال پہلے کی مانند گو نہیں اس کا
مرا بیان مرے ہی بیان جیسا ہے

زمیں پہ آن پڑا ہے انا کا طائر پھر
اگرچہ زاویہ اب بھی اڑان جیسا ہے

○

اس تعلق کا چرچا ہزاروں میں تھا
میرا قاتل بھی کل سوگواروں میں تھا

وہ جو بے باک لفظوں کی زد پر ہے آج
کتنا محفوظ کل استعاروں میں تھا

اس کے شایانِ شاں پر نمایاں نہ تھے
کوئی کتا کوہ پر کوئی غاروں میں تھا

ہر زباں دان ناکام واپس ہوا!
سارا پیغام اس کا اشاروں میں تھا

ایسے ماحول میں زندگی کر گئے
حوصلہ تھا شجاع کچھ تو یاروں میں تھا

یہ طے ہوا ہے کہ ضبط پر ملکیت ہماری
اور اس کے بدلے ستم پہ اس کی اجارہ داری

بدلتی جاتی ہے دن بہ دن شخصیت ہماری
ترا تصور بھی آج کل پڑ رہا ہے بھاری

یہ تیز چلتی ہوئی ہوائیں یہ برف باری
پھر آج برباد کر دی یادوں نے شام ساری

رقیب کا کام بن گیا شوخ حرکتوں سے
گئی اکارت تمام یاروں کی بُرد باری

تمھاری فطرت عجیب سی ہے شجاع خاور
نہ دوستداری نہ ہوشیاری نہ انکساری

جُدائی کا شعور آج انتہا تلک گیا
فراق کے فلک پہ ایک چاند سا چمک گیا

زمیں کا حالِ زار دیکھ کر سبھی پہ شک گیا
خیال میرا طیش میں کل آسمان تک گیا

اُمید کے سفر میں خیریت ہی خیریت ہے بس
اب اس سفر پہ روز کون جائے میں تو تھک گیا

یہ کیا ہوا خیال کو تری صدا کا واہمہ
اُداسیوں کا قافلہ کا قافلہ بھٹک گیا

ہم اپنے آپ میں ہی رہتے مست وہ تو یوں کہو
وجود کا سرا ترے خیال میں اٹک گیا

○

صحیح بات تو یہ ہے کہ تم غلط نہ ہم غلط
غزل کے شعر کہہ کے یوں ہی کر رہے ہیں غم غلط

زبان نے کہا تو ہے کہ سب جہاں میں ٹھیک ہے
بیان دے رہی صاف میری چشمِ نم غلط

وہ راستے ملیں جو منزلوں سے بھی عظیم ہوں
کبھی اُٹھا کے دیکھیے تو ایک دو قدم غلط

جہاں سے چاہیے تھی ابتدا وہیں ہے خاتمہ
کسی نے شرحِ آرزو لکھی ہے یک قلم غلط

شمارِ حشرِ آرزو نہ کیجیے آرزو کے ساتھ
حسابِ زندگی کا آ رہا ہے ایک دم غلط!

Scanned with CamScanner

واوین
(شعری مجموعہ)
شجاع خاور
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ کتابیں پڑھیے
سید حسنین احسن
Imagitor

واوین
(غزلیں اور نظمیں)
شجاع خاور

سال اشاعت ——— فروری ۱۹۸۲ء

قیمت ——— پچیس روپئے

تعداد ——— ایک ہزار

کتابت ——— محمد نورالحق علوی

طباعت ——— نیو پبلک پریس ۱۵۳۴ گلی قاسم جان دہلی

ناشر ——— قصر اردو ۱۴۱۴۸ اردو بازار۔ جامع مسجد دلّی

ڈسٹری بیوٹرز ——— مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلّی

انتساب

"لقمان را پرسند ادب از کے آموختی۔ گفت از بے ادباں۔ ہر چہ از ایشاں در نظر ناپسند آمد، پرہیز کردم"

(سعدیؔ)

ترجمہ:۔ لوگوں نے لقمان سے پوچھا کہ تم نے آداب و اطوار کس سے سیکھے۔ لقمان نے جواب دیا کہ بے ادبوں سے، یوں کہ ان کی جو بات مجھے ناپسند ہوئی اس سے پرہیز کیا۔"

اس لئے

شکریہ کے ساتھ یہ شعری مجموعہ ان سب شاعروں کے نام جو اچھی شاعری نہیں کرتے۔

شجاع خاور

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفانِ ذات بھی نہ ہوا ، رات بھی گئی

واوین سے باہر

شمیم حنفی

دس بارہ برس اُدھر کی بات ہے، شعر کی ایک چھوٹی سی کتاب نظر آئی۔ 'دوسرا شجر'۔ اب تو یہ یاد نہیں کہ اُس وقت کتاب کے بارے میں کیا رائے قائم ہوئی تھی، البتہ عنوان یاد رہا اور اس کے معنی رکھنے کے ان مصرعوں کی رفاقت میں کھلے:

BIRDS FLY THROUGH ME
AND THE TREE I WAS LOOKING AT
IS GROWING IN ME

تو یہ دوسرا شجر کیا ہے؟ ایک لمحے کے حصار سے کھلتا ہوا کوئی اور لمحہ؟ کسی منظر کا عکس؟ کوئی یاد؟ کسی معنی کے معنی؟ یا کایا کلپ کا کوئی تماشہ؟ شاید ایک مستقل بے تعیّنی ہی دوسرا شجر ہے۔ پہلا شجر وہ جو معلوم، مانوس، متعیّن اور بعض اوقات متحجر دکھائی دیتا ہے۔ مگر اسی کے اشارے پر نئے، انوکھے اور غیر متوقع اسرار سے بھرے ہوئے اور غیر متعیّن اسی دوسرے شجر کا خاکہ ابھرتا ہے جس کی جڑیں تخلیقی آدمی کے اپنے تجربے کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک انٹرویو کے دوران اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے بنیادی تجربے کیا ہیں۔ فراقؔ صاحب نے بہت دلچسپ بات کہی تھی۔

یہ کہ بنیادی تجربے بالعموم عام تجربے ہوتے ہیں، ایسے تجربے جن کا قصہ ازل سے جاری ہے اور اپنی بیرونی تفصیلات میں جو معمولی نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کم و بیش ہر تجربہ کسی نہ کسی گذشتہ انسانی تجربے کا عکس ہوتا ہے۔ اس میں اگر کوئی انفرادی حیثیت پیدا ہوتی ہے تو اس کی طرف کسی فرد کے اپنے اس رویّے کے مخصوص روابط اور ان روابط کی شخصی احساس کے سبب۔

شاید اسی لئے شجاع خاور نے اپنی کتاب کو 'وادین' کا نام دیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے اختصاصی عناصر کے تئیں بے پرواہ نہ ہو اور انھی عناصر کے واسطے سے اس مجموعی تصویر کا جائزہ لے جس سے اس کتاب کا کچا چٹھا عبارت ہے وہ اس کے حدود میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے ذاتی یا اجتماعی مفروضات، اپنی ترجیحوں اور مطالبوں کے جبر سے آزاد ہو جائے اور وادین میں جو شہر حواس آباد دکھائی دیتا ہے۔ اس کے رنگوں موسموں اور ذائقوں کو حتی الوسع اس مجموعے کے مصنف کی آنکھوں سے دیکھنے کا اہتمام کرے۔

ظاہر ہے کہ ادب کے ہر قاری کی اپنی شرطیں ہوتی ہیں اور یہ بات کم و بیش مابعد الطبیعاتی ناممکنات کے دائرے میں آتی ہے کہ دوسری کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لئے خواہ وہ تخلیقی اعتبار سے کیسی ہی انوکھی کیوں نہ ہو، اپنی شخصیت کا جوا سر سے اتار پھینکا جائے مگر ہر تجربے کی تفہیم کا عمل خود ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ پھر ہمہ وقت اپنے آپ سے گرانبار رہنا بھی شیوۂ خود پرستاں ہے۔ ہمارے معاشرے میں جب سے خود آگہی کی وبا عام ہوتی ہے شاید اسی لئے لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور اس کے نتیجے میں رنجیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ خود آگہی کا ایک طور یہ بھی ہے کہ آدمی پل دو پل کے لئے آپ

اپنے تئیں بھی بے نیاز ہو جائے۔ بے ساختہ لمحوں میں بے ساختہ تاثر اور روزمرّہ تجربوں کے برجستہ اور بے تکلّف ردِّ عمل کے اظہار سے آنکھیں نہ چُرائے۔ میرا خیال ہے کہ اس رویّے سے شعوری گریز نے ہمارے زمانے کے شاعر اور شاعری دونوں کے لئے بہت مسئلے پیدا کئے ہیں۔ صفات کے چند کلیے، شناخت کے چند نشانات مقرر کر لئے گئے ہیں جنھیں بغیر سوچے سمجھے ہر نئے شعر، نئے شاعر، نئے ادیب پر چسپاں کرنے کی بدمذاقی عام ہے۔ یہ ایک طرح کی نفسیاتی مجبوری ہے جس کا ماحول بنانے میں نیا ادیب، نیا نقاد اور نیا قاری سب کے سب ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔

ہم ایسے تجربوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں جو دراصل تجربے نہیں ہوتے، پرانے تجربوں کی توسیع بھی نہیں ہوتے بلکہ جھیلے ہوئے، آزمائے ہوئے یا محض سنے سنائے ہوئے تجربوں کی تکرار ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک کہنہ مشق استاد نما شاعر نے ایک شعر سنانے سے پہلے تمہید باندھی کہ نیا شعر ہے اور نئے پن کی شہادت کے لئے اس شعر میں ایک لفظ لائے "صحرا"۔ میں نے عرض کیا کہ صحرا تو میرؔ و غالبؔ کے ہاں بھی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بولے کہ ٹھیک ہے مگر میں نے ذات کا صحرا باندھا ہے۔ لاجواب ہو کر میں نے چپ سادھ لی اور اس حال پر افسوس کیا جس تک نئی شاعری نے ایک اچھے بھلے پرانے شاعر کو بھی آخر کار پہنچا دیا تھا۔ محرومی، مایوسی، تنہائی، برگشتگی، بیزاری یہ کیفیتیں برحق کہ آدمی کی جان کو لگی ہوئی ہیں اور یہ قصّہ دو چار دس برس کا نہیں ایک زمانے سے سنتا جا رہا ہے مگر یہ کیا کہ اظہار کے کچھ ڈھلے ڈھلائے سانچے سند باد جہازی کی داستان کے بوڑھے جادوگر کی صورت اس کے شانوں پر سوار ہو جائیں اور اُسے صرف انھی سمتوں میں لے جائیں جو بوڑھے جادوگر کی مرضی کے تابع ہیں۔ خود

راہرو کی طلب و تاب اور ارادہ واختیار سے یکسر آزاد، اوپر سے اوڑھی ہوئی آزادی، اسی طرح سے مجبوری بنتی ہے اور کتابوں کی بخشی ہوئی خود آگہی اسی طور ایک نوع کی خود شکنی کا علامیہ ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ بیشتر صورتوں میں جس شاعری کو آج ہم نئے معاشرے کے نئے فرد کی شاعری کہتے ہیں وہ سرے سے فرد کی شاعری ہے ہی نہیں بلکہ ایک عام رٹ ہے، بے چہرہ و بے نام۔ انفرادی لہجے پر اصرار نئے شاعر کی شرط بنا تو سب سے پہلی آفت لہجے پر ہی آئی۔ روایتی شعراء کے ہاں صنائع لفظی و معنوی کے عام چلن یا بیان کی سطح میں یک رنگی کے باوجود لہجے کی یکسانیت نسبتاً بہت کم تھی جو لہجے کی انفرادیت کو کم و بیش جزو ایمان سمجھنے والے اکثر شعراء کے یہاں وافر دکھائی دیتی ہے۔ یہ قیامت ہماری شاعری میں انفرادی لہجے پر اصرار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ خال خال ہی کچھ شعر اپنے شاعر کے نام پتے کی آگہی دے پاتے ہیں۔

اس طرح شعر کے واسطے سے شاعر کے بنیادی تخلیقی مقصد کی نفی ہوتی رہتی ہے۔ فن اور صنعت کے مابین امتیاز کی سب سے واضح لکیر یہی تھی کہ ایک اپنے ابعاد سے پہچانا جاتا تھا۔ دوسرا اپنے اختصاص سے۔ اچھے برے ہر لکھنے والے کی سب سے بڑی جستجو یہی رہتی ہے کہ اس کا لکھا جو کچھ اس کے اپنے نام سے پہچان لیا جائے۔ تجربوں کے وہ مراکز جن کی تلاش اسے ایک ہجوم کا حصہ بنا دیتی ہے۔ اظہار کی سطح تک آتے آتے خود کو ایک نئے پیکر میں منتقل کر لیتے ہیں۔ اس طرح تمام و کمال ان تجربوں کی شخصیت ہی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ایک موضوع پر متقدمین کے تمام اشعار کا رنگ اور آہنگ بھی ایک ہوتا۔ مگر وہاں ہر چند کہ لہجے کی انفرادیت کا شعور باضابطہ طور پر

کسی بوطیقا کے حوالے سے عام نہیں ہوا تھا، اظہار اسلوب اور لہجے کا تنوع بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے عہد میں شخصی لہجے کی دریافت پر جتنا زور دیا گیا لہجے کی شخصیت اسی تناسب سے بے حرمت ہوتی گئی۔ سبب صاف ہے۔ ہر کس و ناکس کی تلاش کا دائرہ بس یہ ٹھہرا کہ کچھ گھسے پٹے مرکبات، کچھ بار بار کے دہرائے ہوئے الفاظ، کچھ پامال استعاروں اور اونگھتی ہوئی علامتوں سے ایک شعوری اور مصنوعی تعلق اختیار کر لیا جائے۔ نتیجہ جس بھیڑ چال کی شکل میں سامنے آیا وہ سب پر ظاہر ہے۔

دیباچہ نگاری اگر میرے نزدیک ایک منجملۂ افعالِ حمیدہ یا ایک مستقل مشغلہ ہوتی تو کھینچ تان کر میں " وادین " میں ان تمام اوصاف کی نشان دہی کے جتن کرتا جو کسی کتاب کو بے مثال یا غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ تنقید میں ایک زبردست صلاحیت اس بات کی ہوتی ہے کہ بعضے مرغوب و مطبوع اصطلاحات کی مدد سے چاہے تو دن کو رات کر دے۔ ہر کرتب باز کو امیر خسرو کا ثانی بنا دے اور کسی بھی عاجز الفکر لکھنے والے کو ارسطو کا ہم پلّہ ٹھہرا دے۔ اس کرشمہ سازی کی وجہ سے آغا حشر کاشمیری شیکسپیر کے مقابل جا بیٹھے تھے۔ اور ایک بزرگ نے استاد داغ دہلوی کو فرانسیسی والتیر کے جواب میں ہندوستان کا والینٹیر بنا ڈالا تھا۔ (والتیر زبان پر نہ چڑھ سکا) اب حال یہ ہے کہ ہر کس و ناکس کم از کم اردو کا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ تو ہے ہی۔ جواز یہ پیش کر دیا جاتا ہے کہ اگر ایلیٹ نے خرابہ لکھی تو یہ باکمال بھی صنعتی تمدن کے ہاتھوں کچھ کم خراب نہیں ہوئے۔ ہمارے نئے شعراء کی اکثریت خرابی کے اسی مسئلے سے دوچار ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے کہ ہر انسان اسی زندگی کی باتیں کرنے پر مجبور ہے جس سے اس کا سابقہ

پڑا ہو مگر محلِ نظر سوال یہ ہے کہ کیا سچ مچ ان تجربوں کا بیان ہماری نئی شاعری میں اس طور پر ہوا ہے کہ ہم اسے ایک حقیقی واردات کا مظہر کہہ سکیں۔ غالباً نہیں۔ ورنہ نہ تو اس درجہ یکسانیت کا سامنا ہوتا نہ اتنی جلدی فکری ضعف کے آثار جوان العمر شعراء کے یہاں نمودار ہوتے۔ ہر وہ تجربہ جو محض مستعار ہو بہت جلد بے مزہ ہو جاتا ہے اور پرانے سے پرانا تجربہ بھی اگر ہماری اپنی روحانی واردات کا حصّہ بننے کی سکت رکھتا ہو تو پرانا نہیں ہوتا۔ شاعری میں تجربے نئے اور پرانے سے زیادہ سچّے اور جھوٹے ہوتے ہیں اور اسی واقعے کی بنیاد پر ان کی تخلیقی اور جمالیاتی قدر و قیمت متعیّن ہوتی ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ 'واوین' کی غزلوں اور نظموں میں جو تجربے شاعر کے تخلیقی تحرّک کی اساس بنے ان کی نوعیت اکتسابی ہے یا وہبی مگر اتنا ضرور ہے کہ ان کی خارجی اور داخلی ہیئت کئی سطحوں پر بہت سے نئے شاعروں کے تجربات سے مختلف دکھائی دیتی ہے۔ یہ اختلاف کسی غیر معمولی خلّاقانہ جست کا ترجمان نہ سہی تاہم اس اعتبار سے نتیجہ خیز ضرور ہے کہ اس نے ان اشعار کو مروّجہ اور مقبول اسالیب سے الگ ایک نئی ذہنی فضا اور فنّی ذائقے سے روشناس کرایا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی بات جو شجاع خاور کے حق میں جاتی ہے یہ ہے کہ اپنی شاعری کے سلسلے میں انھوں نے ایک تصنع آمیز متانت یا احساس کی حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے عذاب سے خود کو محفوظ رکھا ہے۔ اس طرح وہ بقراطیت کی چمک دمک سے تو محروم ہو گئے مگر اس فکری اور جذباتی ابتذال سے بھی بچ گئے جو اپنی ذات اور اس کے انعکاسات سے مبالغہ آمیز شغف کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اس شغف کے نتیجے میں شخصیت سنجیدگی کے غلاف کے باوجود اندر سے پوپلی ہوتی جاتی ہے اور حواس کے وہ تمام دروازے بند ہوتے جاتے ہیں جو بیرونی دنیا

سے ایک زندہ اور سچے تعلق کا وسیلہ بنتے ہیں۔

اس مختصر مجموعے میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں حقائق کے تئیں اظہار شخصیت کی تمام جہتوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ذہن، جذبے، احساس سب کے سب ایک وحدت کی صورت اپنے تجربوں کا ادراک کرتے ہیں اور اس ادراک کا پتہ جن سطحوں پر دیتے ہیں وہاں سنجیدگی اور شوخی، مزاح اور متانت کے مابین کوئی حدِّ فاصل نظر نہیں آتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا سروکار اپنے وجود کے صرف وہ ارتعاشات نہیں ہیں جن سے صرف تجربے کے امتیازات کی نمائش ہوتی ہے اور صرف وہی پہلو سامنے آتے ہیں جو شخصیت کے تظاہر کا سبب بن سکیں۔ اس کی بصارت اور بصیرت کسی خارجی جبر کی پابند نہیں ہے۔ وہ زندگی کی حقیقی ہیئتوں میں نہ تو کسی تخفیف کا طالب ہوتا ہے نہ اُسے اپنے پسندیدہ مقاصد کا تابع کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے تاثر اور ردِّ عمل پر بھی کوئی حکم نہیں لگاتا اور ہر تجربے کو یہ آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنی قوت اور توفیق کے مطابق اپنی فنّی سرشت اور تخلیقی خاکے کا تعیّن خود کرے۔ چنانچہ کبھی وہ ان تجربوں کی ہنسی اڑاتا ہے کبھی ان کی طرف اپنے رویّوں کی۔

شہر سارا سیر دریا کے لئے نکلا ہے آج
جا، کوئی نیکی ابھی دریا میں جا کر ڈال دے

ہو گیا اس بات پر سب منصفوں میں اتفاق
میں لگا پتھر کو پہلے پھر مجھے پتھر لگا

ملنے لگی ہے عام تو پینا بھی کم ہوا
قلت کے ختم ہوتے ہی بہتات بھی گئی

دکانیں شہر میں ساری نئی تھیں
ہمیں سب کچھ پُرانا چاہئے تھا

تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں

تنہائی گذرنے کو گذر جائے گی لیکن
''چرپائی'' میں ہر روز نیا بان پڑے گا

ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
کچھ دے دلا کے حال کو ماضی بنا دیا

ہاں دو لفظ بھی سوجھے نہیں تم سے جدا ہوتے
ہاں شاعر تے پورا شعر اس منظر پہ لکھا ہے

ہمارے پاس بھی تنہائی کا کافی ذخیرہ ہے
مگر اب ایسی چیزوں کی کرے کوئی تجارت کیا

کٹ کے رہ جاؤ گے سب ہمسفروں سے تم بھی
اس لئے کوئی نئی راہ نکالا نہ کرو

اپنے گھر کی تلاش میں اکثر
دوسروں کے بھی گھر گئے کچھ لوگ

کوئی مر گیا ہو تو ہے اور بات
کوئی مر رہا ہو تو کیا کیجئے

ان اشعار سے جو رویّہ سامنے آیا ہے اسے آپ کیا کہیں گے؟ سنجیدہ، غیر سنجیدہ، طنزیہ، مزاحیہ، فلسفیانہ، غیر فلسفیانہ، عامیانہ، عقلی، جذباتی، یا کچھ اور۔ یہ طے کرنا مشکل ہے۔ اچھے بھلے سنجیدہ سوالات بھی اس رویّے کی زد پر آتے ہی بظاہر HIGH SERIOUSNESS کی چھت سے نیچے زمین پر آگرے ہیں اور کہیں کہیں ہلکے پھلکے تجربوں نے ایک متین افسردگی کی جہت اختیار کر لی ہے۔ پھر زبان و بیان کے معاملے میں بھی بعض مقامات پر یہ رویّہ غیر شرعی ہو گیا ہے۔ اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں اسے ایک نوع کی خلّاقانہ خود اعتمادی سے تعبیر کروں گا جو اپنے ظاہر پر کوئی حکم

لگائے بغیر اپنے منشاء کے مطابق اپنے اظہار کا سانچہ تیار کرتی ہے۔ روایت آزمودہ مضامین کے باب میں بھی من مانی سے کام لیتی ہے اور اپنی خارجی کائنات کی طرح اپنے باطن کی آزادی کا بھی تحفظ کرتی ہے۔ دور کیوں جائیں وہی ایک شعر دیکھئے جس میں 'چرپائی' کی حالت زار کا تذکرہ ہے۔ اچانک یاد آیا کہ میرؔ صاحب نے بھی اپنے ایک شعر میں اس غیر ثقہ لفظ کو عشقی تجربے کی ایک بہت عام سمت سے روشناس کرا کے ایک انوکھی جمالیاتی قدر کا علامیہ بنا دیا تھا۔ ان کا شعر یوں تھا۔

تری گلی میں کبھوا سے کشتۂ عالم
ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

کہاں کشتۂ عالم کا طمطراق کہاں چارپائیوں کی بے سروسامانی اور شجاع خاورؔ کے یہاں تنہائی کا مقدس، متین، مفکّرانہ تجربہ (جو فی زمانہ نئے شعراء میں بہت مقبول ہوا۔) ایک خستہ حال 'چرپائی' کے ہاتھوں بے حرمت دکھائی دیتا ہے۔

حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کی طرف ایک غیر سنجیدہ زاویے سے نظر کرنا بھی سنجیدگی ہی کا ایک طور ہے۔ یہ طور اوپر سے اوڑھی ہوئی سنجیدگی میں شامل جھوٹ کی ہنسی اڑاتا ہے اور اس طرح ایک سنجیدہ مقصد کی عکّاسی کرتا ہے۔ دوسری طرف اسی کتاب میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں۔

آپ کی تنہائی سے کھیلیں گے ہم
رات کچھ بچے مرے سر ہو گئے

میں نے پوچھا تھا خودی کا فلسفہ
آپ تو آپے سے باہر ہو گئے

جن کی الم آمیز متانت محض اپنی صورتِ حال (SITUATION) کی بوالعجبی کے سبب ایک تمسخر آمیز رخ اختیار کر لیتی ہے اور پھر تجربے کے وہ ابعاد بھی ہیں جن کا مرکز اور ماحصل دونوں احساس کی طہارت اور روح کے حزنیہ ارتعاش کے سبب اپنی تمام سطحوں پر سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔

یاد کی بستی سے گذرا تو نظر جاتی رہی
ایک منظر ٹھیک میری آنکھ پر آکر لگا

ضبط سے ٹوٹ گیا سارا جسم
پاؤں چادر سے نہ باہر نکلا

میں آسماں پہ جا کے بھی تارے نہ لا سکا
تم بھی ہوئے اداس مری بات بھی گئی

روح کی فلسفہ کوشی نے پہل کی تھی جناب
جسم کے وار حقیقت میں جوابی نکلے

آتے آتے یاد آئیں گے پرانے راستے
جاتے جاتے ذہن کی آوارہ گردی جائے گی

جنگل مجھ کو کیا دے دے گا
وہ تو خود ویراں ہوتا ہے

رخصت کے وقت روٹھ گیا ہم سے ایک دوست
باقی تمام دوست بہت ٹوٹ کر ملے

وہ شہر تو آباد تھا لوگوں سے ہمیشہ
ہاں لوگ ہی ایسے تھے کہ آباد نہیں تھے

تجھے اونچی اڑانوں کے سفر میں موت آئے گی
پرندے دیکھ بالکل صاف تیرے پر پہ لکھا ہے

میاں اس شہر میں سب لوگ ویسے بھی تو زندہ ہیں
تمھارے کام آئے گی یہ جینے کی مہارت کیا

ان شعروں کی سنجیدگی کا یہ امتیاز بھی سراہے جانے کے لائق ہے کہ ان میں

Scanned with CamScanne

فلسفیانہ یا نیم فلسفیانہ پوز کو کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے ۔اس واقعے کے باوجود کہ قدم قدم پر اس کے لئے گنجائشیں موجود تھیں' ہائی برو' افراد کی طرح' ہائی برو' شعر بھی ایک طرح کے فکری قبض کا شکار ہو جاتا ہے۔ان اشعار میں عنصری سادگی کی شفاف فضا ایسے تمام اثرات سے پاک دکھائی دیتی ہے جو سادگی میں بھی بناوٹ کے انداز پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ تجربے کی عام سیدھی سچّی انسانی سطح ہے جو تفکّر کا لبادہ اوڑھے بغیر بھی فکر اور احساس کے دور دراز علاقوں کی خبر لاتی ہے اور اپنی مانوسیت کی برجستگی سے حیران کرتی ہے۔

عجیب مانوس اجنبی تھا ، ہمیں تو حیران کر گیا وہ
(ناصر کاظمی)

یہ بات میں نے شروع میں ہی عرض کر دی تھی کہ یہ سب لکھنے کے لئے میں نہ تو خود کو دیباچہ نگار بنانے پر تُلا بیٹھا تھا نہ ہی اس مجموعے کے شاعر کا یہ تقاضہ تھا۔چنانچہ میں اپنے آپ کو اس ذمے داری سے بھی آزاد محسوس کرتا ہوں کہ 'واوین' پر نظر ڈالتے ہوئے اس کی غزلوں اور نظموں دونوں کی صنفی خصوصیات کے حوالے سے بہت باضابطہ قسم کی گفتگو کروں۔میں نے تو یہاں سروکار صرف اس بسیط فنّی اور تخلیقی رویّے سے رکھا جو 'واوین' کی غزلوں اور نظموں میں کم و بیش ایک سی کیفیت کے ساتھ خود کو نمایاں کرتا ہے۔فرق اگر کچھ ہے تو درجات کا یا ان عناصر کا جو بہرطور شعر کی مختلف صنفوں کے اپنے جبر کے پابند ہوتے ہیں۔اس مجموعے کی کم از کم سات آٹھ نظمیں ایسی ہیں جن پر اچھے خاصے مضامین باندھے جا سکتے ہیں۔' سوکھی زمینوں کے حق میں'، 'پچھل پیری'، ' لاشعر'، ' دو قیامتوں پر ایک نظم '، 'بچوں کی ایک نظم بڑوں کے نام'

کی ڈرامائیت کہیں کہیں داستان طرازی کا سحر اور بصیرت کی شوخی انھیں ایسے تخلیقی تجربوں کی حیثیت دیتی ہے جو بہت عام نہیں ہیں۔ ان کا سب سے اہم پہلو طنز اور WIT کے وہ عناصر ہیں جن سے ہمارے بیشتر شعراء ہاتھ ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا متانت کا سحر ٹوٹ نہ جائے۔ شجاع خاور نے باہر سے زیادہ اپنے اندر توڑ پھوڑ مچائی ہے اور سرکش تجربوں کو مار باندھ کر منظم کرنے کے بجائے ان کے تحرک اور تفاعل کی ہر جہت کو ایک سی آزادی کے ساتھ روشن کرنے کی جستجو کی ہے۔ اس جستجو کی تفصیلات کے لئے آگے کے صفحات حاضر ہیں۔

میں نے تو جان بوجھ کر خود کو 'واوین' سے باہر رکھا کہ اس مجموعے کے ایک شعر پر نظر پہلے ہی ٹھٹک گئی تھی۔

مجھے قریب سے دیکھو کچھ اور دور ہٹو
تمہاری آنکھ اُجالے سے اب بھی خیرہ ہے

سو میں دُور ہٹ گیا اور باہر سے یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ فاصلے میں بھی قرب کے بہت انداز چھپے ہوتے ہیں۔

شمیم حنفی

۸ رجنوری ۱۹۸۲ء

بسیرا۔ جامعہ نگر

نئی دلّی۔ ۱۱۰۰۲۵

دعائیہ

مسئلہ کوئی قبیلے کا کوئی ذاتی ہے
کیفیت اس لئے میری بڑی جذباتی ہے
یا الٰہی تو اگر ہے تو ہویدا ہو جا
اور نہیں ہے تو ابھی وقت ہے پیدا ہو جا
اپنے مظلوموں کی تھوڑی سی پذیرائی کر
غیب کے حال سے ظالم کی شناسائی کر
پہلے وقتوں کی روایات کو پھر زندہ کر
جیسے بھی ہو مرے احباب کو شرمندہ کر

مرے دل میں بھی زمانے کی کدورت بھر دے
مجھ کو بھی دوسرے بندوں کے برابر کر دے
اور کچھ ہو نہ ہو اتنا ہی کرم ہو جائے
دوستوں سے مری ناراضگی کم ہو جائے
یا تو جہ مری دنیا کی طرف پوری دے
یا پھر اک اور خدا کی مجھے منظوری دے
ہے اگر تجھ کو مری زود نویسی منظور
رکھیو مولا مجھے بسیار نویسی سے دور
کچھ نہ کچھ ظرفِ سماعت بھی خطیبوں کو دے
خود پہ ہنسنے کی توانائی ادیبوں کو دے
علم و دانش کی فراوانی ہے گھر گھر مولا
زندگی کو کوئی مفہوم عطا کر مولا
سونپ دی تو نے جنھیں سلطنتِ شعر و ادب
شعر گوئی کا سلیقہ بھی انھیں دے یارب
شاعری سے مرے اللہ تو خائف کیوں ہے
یہ تو ہر دورِ جہالت کے لئے موزوں ہے

غزلیات
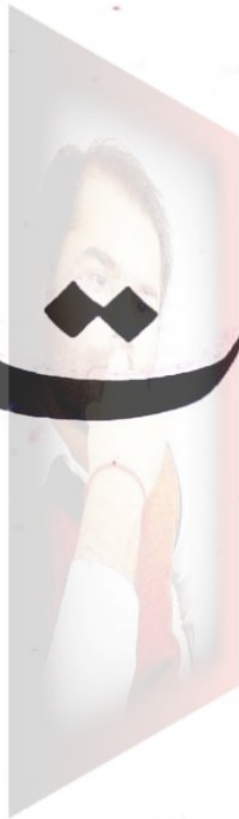
ادب و شعر کے الفاظ نصابی نکلے
سب جنھیں رند سمجھتے تھے شرابی نکلے

پھوٹ کر روئے بنا مسئلے حل ہو نہ سکے
سوچنے کے سبھی انداز کتابی نکلے

آپ سب بھی تو اسی شہر میں رہ لیتے ہیں
عین ممکن ہے کہ مجھ میں ہی خرابی نکلے

روح کی فلسفہ کوشی نے پہل کی تھی جناب
جسم کے وار حقیقت میں جوابی نکلے

پارسائی کا غم ایسا تھا کہ پیتے ہی رہے
یعنی کچھ لوگ تو حد درجہ شرابی نکلے

۱۹۸۰ء

اس طرح پہنچے گا کیسے پایۂ تکمیل کو
آخری کہتا ہے کیوں تابوت کی ہر کیل کو

خود ضرورت مند ہے روتا ہے خود ترسیل کو
چاہیئے پیغامبر اپنے لئے جبریل کو

کب سے سوتا ہے کرو بیدار میکائیل کو
ورنہ کافی کام مل جائے گا عزرائیل کو

تو نے گو کوئی کسر چھوڑی نہیں ربّ کریم
کام یہ کرنا پڑے گا پھر بھی اسرافیل کو

شہر کے قانون دن میں توڑنا آساں نہ تھا
رات میں نکلی ہے دنیا علم کی تحصیل کو

سنہ ۱۹۸۰ء

الحاد سے مہنگا مجھے ایمان پڑے گا
چھت ٹوٹی تو کمرے میں فلک آن پڑے گا

ظاہر ہے کہ تشویش میں انسان پڑے گا
ہر سال اگر جون میں رمضان پڑے گا

تخلیق کی راہوں میں بھٹک جاؤ گے یارو
تنقید کا رستہ تمھیں آسان پڑے گا

یاروں کے لئے گھر کی یہ پہچان بہت ہے
دروازے سے پہلے مرا دالان پڑے گا

تنہائی گذرنے کو گذر جائے گی لیکن
چرپائی میں ہر روز نیا بان پڑے گا

سنہ ۱۹۸۰ء

ایسا لگتا ہے ابھی تک دورِ سُلطانی میں ہوں
اپنی قسمت ہوں مگر اوروں کی پیشانی میں ہوں

سو گناہوں کی تمنا ایک کی فرصت نہیں
اور اس پر یہ کہ میں اس عالمِ فانی میں ہوں

دوسری دنیا بنانے کے ساماں نہیں
کیا بتاؤں آج کل کتنی پریشانی میں ہوں

خشکیوں پر تپلنے والوں کو تو مجھ پر رشک ہے
اُن سے یہ کیسے کہوں میں سر تلک پانی میں ہوں

اور کچھ دن ہے توازن روز و شب میں دوستو
اور کچھ دن مست میں اپنی تن آسانی میں ہوں

سنہ ۱۹۸۱ء

ایک دن خدار کھتے ہم کو آگہی ہوگی
کان پر قلم ہوگا ہاتھ میں بہی ہوگی

کائنات یوں ہی تو میں نہیں بنا دیتا
کوئی بات تم نے بھی کان میں کہی ہوگی

دوستو تمھارے بھی شعر کہہ دیئے میں نے
تم نے کس طرح میری شاعری سہی ہوگی

خود بسا کے شہر آخر چھوڑ کیوں دیا ہم نے
شہر میں یقیناً یہ بات چل رہی ہوگی

فلسفوں کو پھر پڑھ کر سوچنے لگا ہوں میں
آج مجھ کو وہ لڑکی یاد کر رہی ہوگی

۱۹۸۰ء

○

برا سا لگتا تھا جب بھی دیکھو یہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے
حقیقتوں نے اُدھیڑ ڈالا خیال اوندھا پڑا ہوا ہے

مقابلہ موسموں میں کل پھر سنا ہے کافی کڑا ہوا ہے
نہ رات چھوٹی ہوئی ہے اب تک نہ دن ہی کوئی بڑا ہوا ہے

گذشتہ لمحات کو بلالو، نوشتہ الفاظ کو ملالو
جواب تیار کر کے نکلو سوال باہر کھڑا ہوا ہے

میاں عموماً تو دشمنی لوگ کرتے رہتے ہیں دشمنوں سے
بس ایک ہی شخص شہر میں ہے جو دوستوں سے لڑا ہوا ہے

سِرے سے جب ذات ہی نہیں تھی تو شورشیں پھر کہاں سے آتیں۔
وہ ذات کی شورشوں کا قصّہ تو دشمنوں کا گھڑا ہوا ہے

سنہ ۱۹۸۰ء

بوجھ باقی سب مؤرخ کے قلم پر ڈال دے
تو بھی ناہموار میدانوں میں لشکر ڈال دے

ہم نشینوں کی نفاست سے بچا کر رکھ اسے
ذہن کی آلودگی کو گھر کے باہر ڈال دے

لوگ زندہ ہیں تو جا اس بات کی تصدیق کر
رات کو اس شہر کے گھر گھر میں پتھر ڈال دے

شہر سارا سیرِ دریا کے لئے نکلا ہے آج
جا، کوئی نیکی ابھی دریا میں جا کر ڈال دے

کام چل جاتا ہے اکثر ایک ہی مفہوم سے
دوسرے مفہوم کو شعروں کے اندر ڈال دے

سنہ ۱۹۸۱ء

ترے خلوص نے آنکھوں سے حال پوچھا ہے
ہمارے درد کو لفظوں نے گھیر رکھا ہے

ہر ایک بات پہ مجھ سے سوال کرتا ہے
مرا شعور مرے خون کا پیاسا ہے

زمین یوں ہی نہیں گھومتی کسی کے گرد
مجھے بھی دوستو دن رات جلنا پڑتا ہے

نہ اتنے زور سے سوچو کہ جاگ اٹھے وہ
خدا ابھی ہمیں تخلیق کر کے سویا ہے

مجھے قریب سے دیکھو، کچھ اور دور ہٹو
تمھاری آنکھ اجالے سے اب بھی خیرہ ہے

سنہ ۱۹۷۰ء

”تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے“
(غالب)

تفسیرِ کائنات سے یارب مفر ملے
کرنے کو کوئی کام ہو، رہنے کو گھر ملے

کردار یوں لکھو کہ حقیقی دکھائی دیں
منظر ملے کسی کو کسی کو نظر ملے

رخصت کے وقت روٹھ گیا ہم سے ایک دوست
باقی تمام دوست بہت ٹوٹ کر ملے

وہ بھی زمیں سے بھاگ کے آئے تھے رات میں
کچھ اور آدمی بھی ہمیں چاند پر ملے

ہم تبصرہ ضرور کریں گے حیات پر
دو چار روز جینے کی فرصت اگر ملے

سنہ ۱۹۸۱ء

جو تم سے پہلے آئے تھے ان کی کارستانی دیکھو
گاؤں سے نکلے ہو تو اب شہروں کی ویرانی دیکھو

سوتے میں مرنے کا موقع مل جاتا ہے سب لوگوں کو
پھر بھی زندہ اٹھ جاتے ہیں لوگوں کی نادانی دیکھو

روکو گے تو پھٹ جاؤں گا یارو تم بس اتنا کرنا
کچھ مت کہنا مجھ سے جب میری آنکھوں میں پانی دیکھو

ساتوں عالم سر کرنے کے بعد اک دن کی چھٹی لے کر
گھر میں چڑیوں کے گانے پر بچوں کی حیرانی دیکھو

اتنے فرعونوں کو مارو گے تو کیا تم بچ جاؤ گے
موسیٰ جی یہ غصہ چھوڑو اور اپنی آسانی دیکھو

سنہ ۱۹۸۱ء

o

جو قاری کہے سن لیا کیجئے
علامت کی تشریح کیا کیجئے

کتابوں میں ہوں گے کتابت کے عیب
میاں آپ چھرے پڑھا کیجئے

خدائی پہ خاموش رہتے ہیں لوگ
خدائی کا دعوٰی ذرا کیجئے

کوئی مر گیا ہو تو ہے اور بات
کوئی مر رہا ہو تو کیا کیجئے

ہمیں بھی ہے افلاک سے اختلاف
ہمارے لئے بھی دعا کیجئے

۱۹۸۱ء

خدا کو آزمانا چاہئے تھا
کسی کا دل دکھانا چاہئے تھا

دکانیں شہر میں ساری نئی تھیں
ہمیں سب کچھ پرانا چاہئے تھا

نظریئے فلسفے اپنی جگہ ہیں
ہمیں شادی میں جانا چاہئے تھا

تکلف روز روز اچھا نہیں ہے
گلی میں بھی نہانا چاہئے تھا

وہ دل میں تھی کہ گھر میں، آگ تو تھی
پڑوسی کو بتانا چاہئے تھا

سنہ ۱۹۸۰ء

○

دن بھر میں ایک پل بھی سکوں، مل نہیں سکا
سورج تمام وقت مجھے گھورتا رہا

وہ جسم زاد اور بھی رسوا یہاں ہوا
میں تھا سفید پوش اجالے میں چھپ گیا

ہنستے ہوئے کھلونوں کی آنکھیں ٹھہر گئیں
میں عید کر رہا تھا کہ رمضان آگیا

مجھ کو دکھا دی سمت اجالے کے شہر کی
اندھا جہان پھر بھی مرے ساتھ کر دیا

تم لوگ اب بھی نیک ہو؟ حیرت کی بات ہے
تم کو کسی گناہ کا موقع نہیں ملا؟

سنہ ۱۹۷۳ء

ذات کے عرفان کا الزام میرے سر لگا
نیند کیا آئی تھی ساری رات مجھ کو ڈر لگا

یاد کی بستی سے گذرا تو نظر جاتی رہی
ایک منظر ٹھیک میری آنکھ پر آ کر لگا

ہو گیا اس بات پر سب منصفوں میں اتفاق
میں لگا پتھر کو پہلے پھر مجھے پتھر لگا

رات بھر محرومیوں کی گود میں سوتے رہے
ایک بھی سلوٹ نہ آئی رہ گیا بستر لگا

شہر میں تفریح کی کوئی جگہ ملتی نہیں
ایک میلہ بھی لگا تو شہر کے باہر لگا

سنہ ۱۹۸۰ء

زلزلہ خود مرے اندر نکلا
میں بھی بے کار سڑک پر نکلا

شہر کے بیچ میں اک گھر نکلا
دن نکلتے ہی مرا ڈر نکلا

ذات کے خول سے باہر نکلا
وہ مرے پاس سے ہو کر نکلا

تہی دستی کی روایت، اللہ!
بخت میں میں بھی سکندر نکلا

ضبط سے ٹوٹ گیا سارا جسم
پاؤں چادر سے نہ باہر نکلا

۱۹۷۹ء

زہر کھا کے گذر گئے کچھ لوگ
زندگی کھا کے مر گئے کچھ لوگ

دن میں ایسی زمین تنگ ہوئی
رات میں چاند پر گئے کچھ لوگ

سو درندے شکار کر کے بھی
اک پرندے سے ڈر گئے کچھ لوگ

اپنے گھر کی تلاش میں اکثر
دوسروں کے بھی گھر گئے کچھ لوگ

خود نہ جانے کہاں گئے لیکن
شہر آباد کر گئے کچھ لوگ

۱۹۸۰ء

سانس لینے پر مقرر ہو گئے
ہم بھی لوگوں کے برابر ہو گئے

کر دیا حیران اک تصویر نے
ایسے پگھلے ہم کہ پتھر ہو گئے

میر جی ایسی غزل گوئی بھی کیا
سننے والے گھر سے بے گھر ہو گئے

آپ کی تنہائی سے کھیلیں گے ہم
رات کچھ بچے مرے سر ہو گئے

میں نے پوچھا تھا خودی کا فلسفہ
آپ تو آپے سے باہر ہو گئے

۱۹۸۰ء

"اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی"
(میرؔ)

سردی بھی ختم ہو گئی برسات بھی گئی
اور اس کے ساتھ گرمیٔ جذبات بھی گئی

اس نے مری کتاب کا دیباچہ پڑھ لیا
اب تو کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی

میں آسماں پہ جا کے بھی تارے نہ لا سکا
تم بھی ہوئے اداس مری بات بھی گئی

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفانِ ذات بھی نہ ہوا، رات بھی گئی

ملنے لگی ہے عام تو پینا بھی کم ہوا
قِلّت کے ختم ہوتے ہی بہتات بھی گئی

۱۹۸۱ء

سوچ کو زورِ قلم سے کبھی ٹالا نہ کرو
شعر کو حیرتِ الفاظ میں ڈالا نہ کرو

کٹ کے رہ جاؤ گے سب ہمسفروں سے تم بھی
اس لئے کوئی نئی راہ نکالا نہ کرو

کیوں مرے شعر غلط ہیں یہ بتا دو اک دن
فلسفو روز مجھے سوچ میں ڈالا نہ کرو

دن کو نگلا ہے چلو رات کو بھی پی جاؤ
چھوڑو، دنیا کا توازن تہ و بالا نہ کرو

گرتی دیوار کو کیا روک سکے گی یہ بیاض
شعر کہہ کہہ کے ان اوراق کو کالا نہ کرو

سنہ ۱۹۷۳ء

کسے بتاؤں آج مجھ پہ وقت کیا برا پڑا
پرندہ زخمی ہو کے سیدھا میرے گھر میں آ پڑا

تعلقات دوسروں سے اور بھی بگڑ گئے
مرا خیال اڑ کے دوسروں کے گھر میں جا پڑا

کہانی مجھ پہ عام سی لکھی تھی ایک دوست نے
پر اختتام سن کے کچھ مجھے بھی سوچنا پڑا

تمام بھولے راستے اسی نشاں سے مل گئے
کل اک گلی کے موڑ پر ہمارا مدرسہ پڑا

بلند فکر لوگ لوٹتے نہیں زمین پر
خیال چاہئے ہمیں بھی اب کوئی گرا پڑا

سنہ ۱۹۸۰ء

○

کیوں اتنا حیراں ہوتا ہے
لوگوں میں طوفاں ہوتا ہے

بچو جاؤ پتھر لاؤ
پتھر میں امکاں ہوتا ہے

بستی میں گھر، گھر میں چولھا
چولھے میں انساں ہوتا ہے

پک جاتا ہے جب پورا دن
تب شب کا ساماں ہوتا ہے

جنگل مجھ کو کیا دے دے گا
وہ تو خود ویراں ہوتا ہے

سنہ ۱۹۸۰ء

فرعون کی بستی میں بھی ہم شاد نہیں تھے
موسیٰ! مگر ایسے بھی تو برباد نہیں تھے

آزاد روی کے تھے جو پابند ہمیشہ
ظاہر ہے کہ وہ لوگ بھی آزاد نہیں تھے

وہ شہر تو آباد تھا لوگوں سے ہمیشہ
ہاں لوگ ہی ایسے تھے کہ آباد نہیں تھے

بچوں نے جوانی کو بڑے غور سے دیکھا
اک روز جماعت میں جب استاد نہیں تھے

شاعر بنے آخر اسی موقع کی بدولت
جس موقع کے اشعار ہمیں یاد نہیں تھے

فلسفوں کو اہمیت گر اس قدر دی جائے گی
جان پھر کیسے کسی کے نام پر دی جائے گی

بات کہہ جائیں گے ہم اور لوگ سمجھیں گے مذاق
نام کے خانے میں اب کے عمر بھر دی جائے گی

پہلے کچھ باتوں کو شعروں میں چھپایا جائے گا
اور پھر ہر شعر کی تشریح کر دی جائے گی

آتے آتے یاد آئیں گے پرانے راستے
جاتے جاتے ذہن کی آوارہ گر دی جائے گی

گھر سے باہر آ کے سورج کا تعاقب کیجئے
گرم آہوں سے بھلا کیسے یہ سر دی جائے گی

۱۹۷۹ء

○

لفظوں میں ڈالیئے کوئی الجھن مری طرح
پھر کہہ سکیں گے شعر یقیناً مری طرح

غیروں سے بات کرتے ہو قصداً مری طرح
مہنگا پڑے گا آپ کو یہ فن مری طرح

ہو جائیے ہر ایک سے بد ظن مری طرح
کیجے دل و دماغ کو روشن مری طرح

دنیا سے اجتناب بری چیز ہے میاں
اللہ نہ دے کسی کو نیا پن مری طرح

لوگ آپ سے بھی ملنے لگے ہیں ادب کے ساتھ
کیا آپ سے بھی ہو گئی ان بن مری طرح

سنہ ۱۹۷۹ء

لوگوں نے ہم کو شہر کا قاضی بنا دیا
اس حادثے نے ہم کو نمازی بنا دیا

تم کو کہا جو چاند تو تم دور ہو گئے
تشبیہ کو بھی تم نے مجازی بنا دیا

ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
کچھ دے دلا کے حال کو ماضی بنا دیا

بغضِ معاویہ میں سبھی ایک ہو گئے
اس اتحاد نے مجھے نازی بنا دیا

خالی علامتوں سے معانی نکال کر
تنقید کو بھی شعبدہ بازی بنا دیا

سنہ ۱۹۸۰ء

"اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا"
(مومن)

مرثیہ کام کا نہیں ہوتا
ہاں قصیدہ برا نہیں ہوتا

ایک عالم بنا دیا اس نے
بے قراری میں کیا نہیں ہوتا

رات میں آدمی نہیں ملتا
اور دن میں خدا نہیں ہوتا

اتنے کردار ہیں کہانی میں
کیوں کوئی واقعہ نہیں ہوتا

سارے شاعر جوان ہیں پھر بھی
شاعری کا بھلا نہیں ہوتا

۱۹۸۱ء

نہایت مختصر اک واقعہ پتھر پہ لکھا ہے
'نہ باہر ہیں نہ اندر ہیں' ہمارے گھر پہ لکھا ہے

تجھے اونچی اڑانوں کے سفر میں موت آئیگی
پرندے دیکھ بالکل صاف تیرے پر پہ لکھا ہے

یہاں دو لفظ بھی سوجھے نہیں تم سے جدا ہوتے
وہاں شاعر نے پورا شعر اس منظر پہ لکھا ہے

پرانے شہر کے باشندے پردے کے مخالف ہیں
دلوں کا حال تک لوگوں کے بام و در پہ لکھا ہے

اسے ترسیل کی ناکامیوں کا المیہ کہئے
کہ ہم نے اک قصیدہ اپنے نامہ بر پہ لکھا ہے

سنہ ۱۹۸۰ء

○

وجدان میں وہ آیا الہام ہوا مجھ کو
میں بھول گیا اس کو وہ بھول گیا مجھ کو

اب ڈوب ہی جانے دے اتنا نہ گرا مجھ کو
شرمندہ نہ کر ڈالے تنکے کی انا مجھ کو

میں گم شدہ لوگوں کی فہرست میں دب جاتا
وہ تو مرے دشمن نے پہچان لیا مجھ کو

اس عہد میں کیا رکھا تھا جس پہ بسر ہوتی
کیا ہوتا جو ورثے میں ملتا نہ خدا مجھ کو

اتنی بڑی دنیا میں کب سے میں اکیلا ہوں
اے ربِّ کریم اپنے بندوں سے ملا مجھ کو

سنہ ۱۹۸۰ء

○

وہی تنا ؤ وہی بات بات کا قصّہ
سناتے پھرتے ہیں اخبار رات کا قصّہ

ترے عروج مرے انحطاط کا قصّہ
بہت سنا ہے حیات و ممات کا قصّہ

یہاں کے لوگ تو ہم کو خدا سمجھتے ہیں
کسے سنائیے اپنی وفات کا قصّہ

کسی کا راز کسی کی زباں کسی کے گوش
ہمیں جچا نہیں عرفانِ ذات کا قصّہ

نہ سر پہ سایہ نہ تن پر لباس ہے باقی
حضور چھوڑیئے اب کائنات کا قصّہ

۱۹۷۸ء

○

ہم اپنے نظریات کو ٹھکرائے ہوئے ہیں
وہ ہم کو اسی بات پہ اپنائے ہوئے ہیں

سر دھنتے ہیں اخبار کو پڑھ پڑھ کے یہاں لوگ
یعنی ادب و شعر سے اکتائے ہوئے ہیں

تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں

میں نے ابھی ان پر کوئی تنقید نہیں کی
کچھ دوست اسی بات سے گھبرائے ہوئے ہیں

کیا رکھا ہے اس حلقۂ احباب میں لیکن
ہم تم سے نہ ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

سنہ ۱۹۸۱ء

ہوا کدھر سے چلے گی بتائیے تو سہی
ہمیں مکان کا نقشہ دکھائیے تو سہی

لبِ نگہ پہ کوئی حرف لائیے تو سہی
مری زبان کو نیچا دکھائیے تو سہی

کسی کے سامنے بے باک آئیے تو سہی
کبھی خلوص کی دیوار ڈھائیے تو سہی

یہ تنگ رستہ کشادہ کرائیے تو سہی
روایتوں کو کبھی گھر بلائیے تو سہی

بلا سے مرکزی کردار کو بدل دیجے
کہانیاں مجھے اپنی سنائیے تو سہی

۱۹۷۸ء

یہاں نہ رکھ انھیں اللہ کی امان میں رکھ
زمین تنگ ہے خوابوں کو آسمان میں رکھ

قیام اوروں کی خاطر اسی جہان میں رکھ
مگر ضرور زمیں اپنی بھی کچھ دھیان میں رکھ

بلائیں روز نئی اپنے سر پہ لیتا جا
تمام عمر رفیقوں کو امتحان میں رکھ

شکم پُری کے لئے اتنا کم نظر مت بن
پُرانے طرز کا سامان بھی دکان میں رکھ

بغیر عطف و اضافت نہ لکھ کبھی تنقید
غزل کہے تو ذرا سادگی زبان میں رکھ

متفرقات

میاں اس شہر میں سب لوگ ویسے بھی تو زندہ ہیں
تمہارے کام آئے گی یہ جینے کی مہارت کیا

ہمارے پاس بھی تنہائی کا کافی ذخیرہ ہے
مگر اب ایسی چیزوں کی کرے کوئی تجارت کیا

سنہ ۱۹۷۹ء

نار یل بیچنے والا کوئی ایسا آ جائے
دام کے بدلے چرایا ہوا جو پیتل لے

سنہ ۱۹۸۰ء

سمندر بھی چھوٹا ہوا ہے کبھی
کوئی اور شئے ہو گی بحرِ خفیف

سنہ ۱۹۸۰ء

ذات کہتے تھے جسے بھاگ گئی وہ رنڈی
گھومتے پھرتے ہیں سڑکوں پہ جدیدی دتّے

سنہ ۱۹۸۰ء

جسم کو شب کی سیاہی نے پناہیں دی تھیں
روح اب دن کے اجالے میں چھپالی جائے

اپنے ہی سامنے یوں بیٹھ گیا ہوں جیسے
چارو ناچار کوئی بات بنالی جائے

سنہ ۱۹۶۷ء

کبھی کربِ غم کبھی کیفِ غم کبھی سیلِ فکر کی سنسنی
کوئی شغلِ زیست کو چاہیئے نہیں اٹھتا بارِ سبک تنی

یہ تو ہیں اثاثۂ خشک و تر مرے آبلوں کو بھی کیا خبر
وہ رہِ سفر کے معاملے جو نہ گفتنی نہ شنیدنی

سنہ ۱۹۶۸ء

کیا جانئے کس دور میں اب میرا جنوں ہے
احساسِ فنا کربِ فنا سے بھی فزوں ہے

سنہ ۱۹۶۷ء

○

تم آئے ہو اس واسطے مجبور ہوں ورنہ
تجدیدِ تمنا مرے پندار کا خوں ہے

سنہ ۱۹۶۷ء

ٹوٹتے خواب سے الجھتے تھے ملا کچھ بھی نہیں
ہم بہت زور سے چیخے تھے ہوا کچھ بھی نہیں

سنہ ۱۹۸۰ء

کسی دن داخلی جذبات کی تو بھی نمائش کر
کسی محبوب کی آغوش میں مرنے کی خواہش کر

نئے الفاظ کا غصہ ابھی تو نے نہیں دیکھا
پرانے شعر اکٹھا کر کے فوراً نذرِ آتش کر

سنہ ۱۹۸۱ء

اس نے بھی مرے شعر پہ تنقید نہیں کی
میں نے بھی کسی بات کی تردید نہیں کی

سنہ ۱۹۸۰ء

کب یہ سر اٹھانے کا مجھ میں حوصلہ ہوگا
ہائے کب مرے سر سے میرا تن جدا ہوگا

سنہ ۱۹۶۷ء

ہم ہی خائف تھے کسی بات پہ دنیا بھر سے
ورنہ ایسا تو فسوں تیری اداؤں میں نہ تھا

سنہ ۱۹۸۲ء

دوستو میری صحت یابی کا مطلب یہ ہوا
جو دواؤں میں اثر تھا وہ دعاؤں میں نہ تھا

سنہ ۱۹۸۲ء

○

یہ گریزاں نظر پریشاں سی

تند خو، تیز رو، تمنا کار
سب مناظر سے برسرِ پیکار
ہر بلند و بلیغ سے بیزار

جانے کس روشنی پہ چھائے گی
کون سی رفعتوں پہ جائے گی
کس خدا کو زمیں پہ لائے گی

یہ گریزاں نظر پریشاں سی

نظمیں

بچّوں کی ایک نظم

بڑوں کے نام

تمھیں گہرائیوں کا علم ہے ڈوبو گے تم کیسے
سمندر سے تمھارا واسطہ وقتی ہے
بالکل عارضی ہے
اک تمھارا کیا تمھارے شہر بھر کا
تم سمجھتے ہو
سمندر سے پرے تم زندہ رہ جاؤ گے
لیکن یہ بھی سوچا ہے
کہ اس خشکی پہ زندہ رہ بھی جاؤ گے تو اس کا فائدہ کیا ہے ؟

سنا ہے تم کو اتنا علم حاصل ہے
اور اپنے نطق کی باریکیوں سے اتنے واقف ہو
کہ تم بے ساختہ ہنستے نہیں ہو
اور کبھی حیراں نہیں ہوتے
کہ تم کو سب پتہ ہے
کون کیا ہے کیوں ہے اور کیسے ہے
تم دانش زدہ ہو

اور ہمیں دیکھو
ذرا سی بات پر حیران ہو کر دیر تک حیران رہتے ہیں
ہماری بات مانو
ایک دن کے واسطے دانشوری کی چال کو چھوڑو
چلے آؤ سمندر کی طرف
بے ساختہ دوڑے چلے آؤ

ہماری بات مانو

ایک دن حیران ہو کر ڈوب جاؤ اس سمندر میں
مگر ٹھہرو؛
تمہیں گہرائیوں کا علم ہے ڈوبو گے تم کیسے ؟

سنہ ۱۹۷۹ء

براؤننگ کی نظم
کے ابتدائیہ کا ایک غلط ترجمہ

زمیں پر خیریت ہی خیریت ہے

وقت کے لہجے سے ہم آہنگ ہے صبح۔ ہار اندر بہار

اب گوہرِ شبنم سے آرائش ہے ساری وادیوں میں

اور طائر مست ہیں پرواز کی پہنائیوں میں

یعنی سب اپنی جگہ پر ٹھیک ہے
اور خیریت یہ سب زمیں پر اس لئے ہے کہ
خدا آفاق میں محصور ہے
یعنی زمیں سے دور ہے

۱۹۸۱ء

○

پچھل پیری
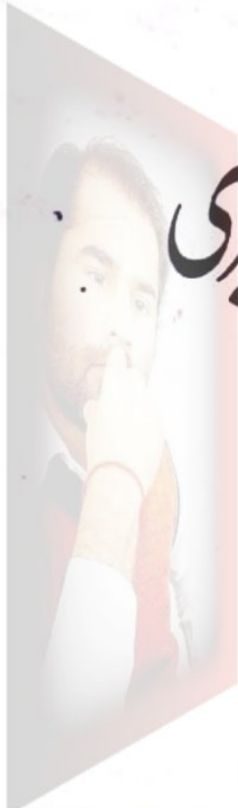
اندھیری رات میں سنسان رستہ

اور اپنوں کی رفاقت بھی نہیں ہے

دوسرے لفظوں میں یوں کہئیے:

تمدن نے بصارت چھین لی ہے

اور اندھیرا اس لیئے ہے: راستوں کی رونقیں تہذیب کے ڈر سے نظر آتی نہیں ہیں

اور کیوں کہ دونوں باتیں صرف مجھ کو ہی پتہ ہیں

اس لئے میں ہوں اکیلا

یعنی اپنوں کی رفاقت بھی نہیں حاصل

ابھی گھر دور ہے

ڈرتا ہوں

اور دل میں بغاوت بھی نہیں ہے

دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے:

میں جانا چاہتا ہوں اس جگہ جو جسم کو آزاد کر دے

وہ پرانا گھر جو کافی دور ہے

ڈر اس لئے ہے:

دوسروں کو جسم کے آزاد کرنے کی تمنا کا پتہ چل جائے تو کیا ہو

بغاوت کر نہیں سکتا

بہت خوش پوش ہوں

ملبوس بھی کافی ہوں

کھُل کر کھیلنے کی میری عادت بھی نہیں ہے

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے :

نفاست اور طرح داری نے میری اوّلیں فطرت کے جوہر کو
کبھی عریاں نہیں ہونے دیا ہے

اک نہیں کافی لباسوں کا بدن پر بوجھ ہے
ظاہر ہے ایسے میں مری مرضی کہاں تک چل سکے گی
کیسے من مانی کروں گا میں

جو میرا راستہ رو کے کھڑی تھی
اب وہ اپنی ایڑیوں کو آگے اور پنجوں کو پیچھے کر کے چلتی آ رہی ہے
اس پہ غالب آ سکوں مجھ میں یہ ہمت بھی نہیں ہے
دوسرے لفظوں میں یوں کہئے :
کہ میری آج کا احساس، کل کی یاد، مستقبل کی ذمہ داریاں
تہذیب کی الجھن، تمدن کی گھٹن

اقدار، ضبط، اخلاقیت

سب راستہ رو کے کھڑے ہیں
آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے
مری ہی ضبط اور تہذیب کی یہ غیر فطری چال

میرے ڈر کا بنیادی سبب ٹھہری
(نہایت غیر فطری چال چلتی ہے پچھل پیری)

نتیجہ سوچ کا یہ ہے:
اُدھر
میں گھر سے کافی دور
اپنوں کی رفاقت سے جدا
سنسان رستے پر اندھیری رات ہیں
ڈرتا ہوا چلتا چلا جاتا ہوں

Scanned with CamScanne
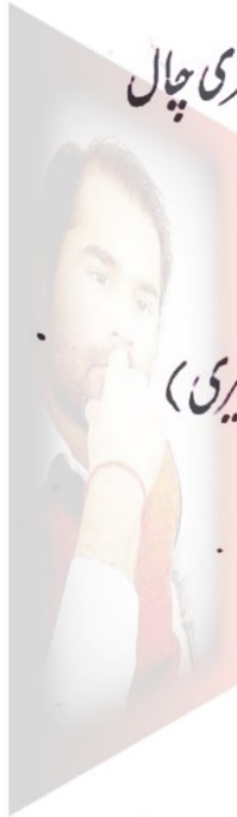
(چلتا کیا ہوں چلنا چاہتا ہوں)
غیر فطری چال سے وہ میری جانب آ رہی ہے
اور اِدھر
یہ خوش لبا ں
میرے ملبوسات کی بہتات
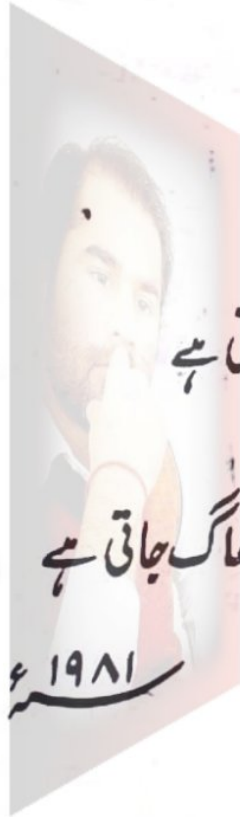
مجھ کو ہی ستاتی ہے
بڑے بوڑھوں کی اک بات آج مجھ کو یاد آتی ہے
وہ کہتے تھے:
چھل پیری کے آگے ننگے ہو جاؤ تو فوراً بھاگ جاتی ہے

۱۹۸۱ء
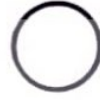
تکلّف برطرف

سنا ہے فرد کی تنہائی ، اس کی ذات
سب اک دوسرے میں مل گئے ہیں
کرب کے گہرے سمندر میں
تبھی ٹوٹے ہوئے شیشوں میں اپنی ذات کے ٹکڑوں کا منظر دیکھ کر

معصوم شاعر
آج تک وجدان کے نوکیلے حِصّے سے علامت کے دہانے گھس رہے ہیں

آپ دل میں سوچتی ہوں گی

کہ میں نے چند لفظوں کو ملا کر رکھ دیا ہے
بات واضح ہو نہیں پائی ہے
مجھ کو کچھ تکلّف ہے

حقیقت یہ ہے:
مجھ پر ایک پیچیدہ علامت کا بڑا آسیب ہے
جس کے طلسمِ ناروا نے مجھ کو ہذیاں گو بنا ڈالا ہے
لفظوں کا معانی سے کوئی رشتہ نہیں ہے
آپ چاہیں تو مجھے آسیب سے آزاد کر دیں
اور علامت کی سبھی گہرائیاں مجھ پر عیاں کر دیں
پھر اس کے بعد مجھ کو بے زباں کر دیں

میں اتنا چاہتا ہوں آپ میرے مسئلوں پر غور کر لیں
اور اپنے مسئلے بھی سامنے رکھ دیں

میں ان پر غور کر لوں گا
مگر سب مسئلے گہرے ہیں
بنیادی ہیں:
کافی وقت لگ جائے گا:

آخر فرد کی 'تنہائی' اس کا 'کرب' اس کی 'ذات'
میرا کرب میری ذات
اور پھر آپ کا کرب آپ کی ذات آپ کی تنہائی
سارے مسئلوں میں صبح ہو جائے گی
سارے 'فلسفے' سارے 'عقیدے'
لمحہ لمحہ ٹوٹتے رشتے
'تمدن کا زوال'
'اقدار کا خوں'
یعنی لفظوں کا معانی سے کوئی رشتہ نہیں ہے

اتنے سارے مسئلے ہیں صبح ہو جائے گی اندازاً۔

یقیناً آپ دل میں سوچتی ہوں گی کہ
میں نے پھر ملا کر رکھ دیا ہے چند لفظوں کو
کہ لفظوں کا معانی سے کوئی رشتہ نہیں ہے
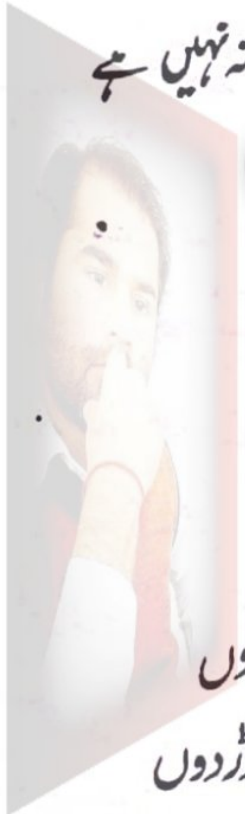
بات واضح ہو نہیں پائی ہے
مجھ کو پھر تکلّف ہے
تو چلئے اب تکلّف برطرف
گر آپ چاہیں؛
میں ابھی لفظوں کا یہ ناپاک جادو توڑ دوں
تنہائی کا تنہائی سے پاکیزہ رشتہ جوڑ دوں
یعنی کڑے وجدان کے نوکیلے حِصّے سے علامت کا دہانہ پھوڑ دوں

۱۹۷۹ء

خدا کی دعا

یوں ہی کیا کم تھی بے معنویت کی شرم
اور اس پر ستم
اپنے اظہار سے دور ہونے کا غم
یعنی شنوائی کا خواب بھی دیکھ پائے نہ ہم
ہم کہ الفاظ کے اجنبستان میں بھی نہیں جا سکے
اپنی آواز کے وار اپنے ہی کانوں پہ سہتے ہوئے
بے صدا ہو گئے
کون سنتا ہمیں، ہم خدا کی دعا ہو گئے

سنہ ۱۹۷۰ء

خدا کی شان میں

قلم کی سسکیاں بھی تھم گئیں جب
فرش سے چھت تک ہر اک بے جان شئے سے سہم کر
میں نے کتابیں بند کر دیں
میز پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹے
گرم بستر کی کُٹی آغوش میں گر کر
میں اپنا بند کمرہ پھاند کر نکلا کہ کوئی دوسرا مل جائے

گلی میں کوئی صورت ہی نہ تھی ایسی جو میری ہو
سڑک پر کوئی چہرہ ہی نہ تھا کہتا جسے میں دوسرا

پہچانتا، آواز دے سکتا
ہر اک بازار بے حس جیسے سارا شہر میرے واسطے پتھر ہو

سارے شہر چھانے ہر جگہ ڈھونڈا
کوئی صورت نظر آئے جو بڑھتی ہو مری جانب
وہ جس کو آس کی چنگاریاں کہتے ہیں، ٹھنڈی ہو نہیں پائیں
فلک کو چیر کر دیکھا
خدا موجود تو تھا
ہاں مگر وہ میرے کمرے تک نہیں آیا

۱۹۶۸ء

○

طویل نظم دوسرا شجر کے ابتدائیہ سے
ایک اقتباس

وہ یقیناً یہ جانتا ہوگا
آگہی ـــــ ہاں وہی قلوپطرہ
آج مجھ سے ہوتی ہے ہم آغوش
کبھی جس کے درِ شبستاں سے
میں نے پردہ اٹھا کے دیکھا تھا
اور پھر اُس نے اپنی جنت سے
مجھے باہر نکال پھینکا تھا
میری معصومیت کی یہ لغزش

سرکشی کا گناہ ہو جیسے
اس کی پاداش مل گئی تھی مجھے
یعنی جنت بدر ہوا تھا میں
(یہ خدائے بہشت کہتا ہے)

جنت گم شدہ کا غم کیوں ہو
میں نے خود اک بہشت ڈھالی ہے
وہ بھی جنت تھی یہ بھی جنت ہے
پھر بھی اک فرق صاف ظاہر ہے
وہ جو جنت تھی خواب زاروں کی
میں تو جزوِ حقیر تھا اس کا
اور یہ جنت تمام میری ہے
ہیں جہاں بے شمار حوّائیں
ہائے یہ بے شمار حوّائیں

یہ سراپا گناہ حوّائیں
ایک ترغیب بھی اگر مل جائے
سیکڑوں جنتوں میں جا پہنچوں
کیا خدا بھی سوچتا ہو گا
آج تک کشتۂ عتاب ہوں میں؟

آفریں ایسے پائے لغزش پر
جس کی معتوب لڑکھڑاہٹ بھی
آگہی کے محل میں لے آئی
آگہی ہاں مری قلوپطرہ
جس کے ناآشنا شبستاں میں
ایک بے نام سے تقاضے پر
کبھی جنت بدر ہوا تھا میں
آج میں نیم خواب نیم دراز

اس کی سانسوں کے شور سے آگے
صبحِ نازائیدہ کے پرتو میں
جب بھی اپنا مآل دیکھتا ہوں
آگہی یہ مری قلوپطرہ
مجھ سے کچھ اور کھلنے لگتی ہے
اور میں پھر ذرا جواں ہو کر
اس کی سانسوں میں ڈوب لیتا ہوں
اس کی سانسوں کا زیر و بم مجھ کو
ایک احساسِ فتح دیتا ہے
اور کچھ ڈوبتا ہوں میں، لیکن
اس کی سانسوں کی تہ نہیں ملتی
مثلِ حیوان ہو کے نااندیش
آگے آئی ہوئی غذا پر، بس
بے قراری سے ٹوٹ پڑتا ہوں

بات میرے خدا کی سچی ہے؛
واقعی کشتۂ عتاب ہوں میں

۱۹۶۸ء

دو شکستوں کے بیچ میں

میں ابھی زندہ ہوں، لوگو
کس کا ماتم کر رہے ہو؟
یوں بھی مُردے تو کبھی ماتم نہیں کرتے ہیں، جاؤ
جاؤ جاؤ

آسمانی طاقتو، آؤ
مرے دعوے کو پائندہ کرو
مردوں کو شرمندہ کرو
یعنی مجھے اک بار پھر زندہ کرو

سنہ ۱۹۷۲ء

دو قیامتوں پر ایک نظم

قیامت کا اندازہ اونچے پہاڑوں سے ہرگز نہ کرنا
جو روئی کے گالوں کی مانند اڑنے لگیں تو قیامت ہوئی
کیوں کہ ایسا تو ہوتا رہا ہے
زمینوں کے زیر و زبر سے بھی تم کو قیامت کا کوئی اشارہ نہیں مل سکے گا
زمینیں تو زیر و زبر ہوتی آئی ہیں
کوئی قیامت، سنو، آنے والے دنوں میں نہیں ہے
قیامت کہ آئندہ لمحات کی آستینوں میں نہیں ہے

جہاں ہم کھڑے ہیں
قیامت یہی ہے کہ
اپنی امیدیں کسی اور دنیا کی تخلیق پر منحصر ہیں

قیامت یہی ہے کہ سب منتشر ہیں
قیامت کے آنے کے سب منتظر ہیں

۱۹۸۱ء

"سچی" اور "اچھی" نظموں کے متعلق

دل پر جو بیتے اس کو نظموں میں ظاہر کر دینے سے
دونوں کو نقصاں ہوتا ہے
دل کو بھی نظموں کو بھی
دل شرمندہ ہوتا ہی ہے
نظمیں بھی پھیکی ہو جاتی ہیں

اپنے دل پر کیا بیتی ہے اس سے اوروں کو کیا مطلب
ایسی نظمیں بس سچی ہوتی ہیں
سچی نظمیں اچھی بھی ہوں یہ ہونا کافی مشکل ہے

اچھی نظمیں وہ ہوتی ہیں
جن میں سب کی باتوں کو
جانے پہچانے لفظوں میں

عمدہ عمدہ تشبیہوں میں کہہ دیتے ہیں
دل کی بھی پردہ داری رہتی ہے
اور نظمیں بھی اچھی ہو جاتی ہیں
سچی نظمیں کہنے والو، یہ تو سوچو

باقی باتیں سب سن لیں گے ذاتی باتوں کا کیا ہوگا
عمدہ تشبیہیں ہوں تو جز باتی لفظوں کا کیا ہوگا
اچھی نظمیں چل جائیں گی سچی نظموں کا کیا ہوگا

سنہ ۱۹۸۱ء

سوکھی زمینوں کے حق میں

ہمارے ضابطے کہتے ہیں
چاہے سب زمینیں سوکھ جائیں
پھٹ پڑیں کٹ جائیں
لیکن گندے پانی گندے نالوں سے بچیں
پس ضابطے بے جا ہیں
بالکل ناروا ہیں

ضابطے تو بولتے رہتے ہیں
بے چاری زمینیں شرم سے کچھ کہہ نہیں سکتیں ہیں

اپنی وضعداری سے بہت بیزار ہیں
اندر سے بالکل اخشک ہوتی جا رہی ہیں

کچھ بھی کرنے کے لیئے تیار ہیں

اس واسطے لوگو
ہمارا فرض بنتا ہے
کہ فوراً ضابطے بدلیں
زمینیں کٹ رہی ہیں
پھٹ رہی ہیں
سوکھتی جاتی ہیں
پانی گندے نالوں میں اکیلا بہہ رہا ہے
(جب کہ بارش پر ہمارا بس نہیں ہے)
اور یہ سچ ہے کہ
کٹتی سوکھتی پھٹتی رمینیں تو

کسی پانی سے بھی شاداب ہو جاتی ہیں
پانی گندے نالوں سے ملے
یا ابرِ رحمت لے کے میکائیل کوئی آئے

پس لوگو ہمارا فرض ہے
ہم گندے نالوں کو جگا دیں
ضابطوں کی سختیاں فوراً ہٹا دیں
پانیوں کو سوکھتی پھٹتی زمینوں سے ملا دیں

سنہ ۱۹۸۱ء

عوام النّاس

یہ مانا
اس نے اک بیمار کو دیکھا تھا
تم نے سینکڑوں بیمار اور بیماریاں دیکھی ہیں
بالکل ٹھیک ہے
اس نے ضعیفی کی طرف اک بار دیکھا تھا
مگر تم نے ضعیفی سے بھی بدتر تنگیاں لاچاریاں دیکھی ہیں
یہ بھی سچ ہے
اس نے اک جنازہ اجنبی کا دور سے دیکھا تھا
تم نے ان گنت اپنوں کے سر پہ موت کی ویرانیاں دیکھی ہیں
یہ سب ٹھیک ہے
انکار کس کو ہے کہ تم بے حد پریشاں ہو

تمھارے ذہن و دل پر ہر اذیّت کار لمحہ اک نئی یلغار کرتا ہے
اُسے اک بار افسردہ کیا تھا اور تمھیں سو بار کرتا ہے

مگر سچ یہ بھی ہے وہ تم سے بالکل مختلف تھا
شاہزادہ تھا
وہ محلوں میں رہا تھا
اس نے شاہی عیش سارے دیکھ رکھّے تھے
طبیعت ایسی نازک تھی
کہ اک دو منظروں کے بوجھ نے ساری نزاکت کو کچل ڈالا
اسے بالکل بدل ڈالا
مگر تم مختلِف ہو
تم تو محلوں سے نہیں آئے
تمھیں تو عیش اور آرام کی عادت نہیں ہے
ایک دو منظر تمہاری سخت جانی کے مقابل کیا کریں گے

تم کو حاصل کیا کریں گے

تم تو بازاروں میں تھے اور ہو

یہ مانا اس نے اک بیمار کو دیکھا تھا
تم نے سینکڑوں بیمار اور بیماریاں دیکھی ہیں
بالکل ٹھیک ہے اس نے ضعیفی کی طرف اک بار دیکھا تھا
مگر تم نے ضعیفی سے بھی بدتر تنگیاں لاچاریاں دیکھی ہیں
اس نے اک جنازہ اجنبی کا دور سے دیکھا تھا
تم نے ان گنت اپنوں کے سر پر موت کی ویرانیاں دیکھی ہیں
پھر بھی بات ہر صورت وہیں پر جا پہنچتی ہے
کہ تم سڑکوں پہ تھے سڑکوں پہ ہو
تم پر کوئی افسردگی اچھی نہیں لگتی

یہیں بیٹھے رہو

بیمار کی بیماریاں بن کر
ضعیفوں کی سبھی لاچاریاں بن کر
جنازے کی سبھی ویرانیاں بن کر
نہ جانے کب کوئی شہزادہ آجائے ادھر
محلوں کی جانب سے
اگر تم ہی نہیں ہو گے کیسے دیکھے گا
کیسے ہو گا افسردہ
اگر بیماریاں لاچاریاں ویرانیاں معدوم ہو جائیں ؟
یہیں بیٹھے رہو
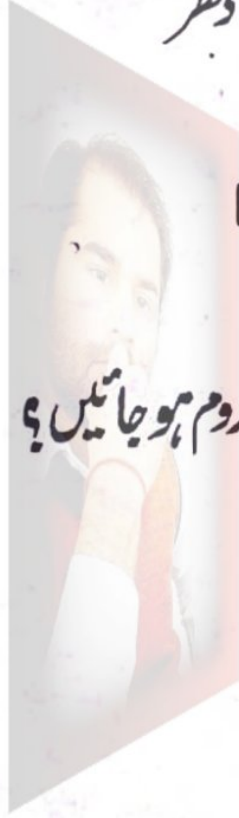
مانا کہ تم پر بھی اذیّت ہو رہی ہے
تم بھی افسردہ بہت ہو
تم مگر افسودہ ہو کر وہ نہیں کرنا جو اس نے کر لیا تھا
وہ تو محلوں سے چلا تھا تم سڑک پر تھے سڑک پر ہو

یہیں بیٹھے رہو

تم آنے والے شاہزادوں کی نزاکت کو کچلنے کے لئے بالکل مناسب ہو

کہ تم خود بھی ضعیفوں کی طرح لاچار رہو

بیمار رہو

اور موت سے دوچار رہو

پھر کیا ضرورت ہے تمھیں جذبات کے اظہار کی

یہ برہمی تم پر نہیں جچتی

اگر اک شاہزادہ اس طرح محسوس کر جائے

اذیّت سے گذر جائے

تو ساری بات کی اک خاص تاریخی اہمیت ہے

کہ سب کو اس پہ حیرت ہے

مگر تم کچھ بھی دیکھو کچھ بھی سہہ لو

کتنی ہی گہری اذیّت سے گذر جاؤ

جوانی میں بھی مر جاؤ

تو اس کی کوئی تاریخی اہمیت تو نہیں ہوگی
کسی کو اس پہ حیرت تو نہیں ہوگی
تمھاری برہمی، افسردگی کیسی؟
تمھیں افسردگی کا حق نہیں، تم ہو عوام النّاس
بنتے ہو
وہ شہزادہ تھا لیکن تم ......
تمھیں تہذیب کا بالکل نہیں ہے پاس
بنتے ہو
بڑے حسّاس بنتے ہو!۔

سنہ ۱۹۸۱ء

فاتح بغاوت کے آخری لمحے کی پہلی صدی

نہیں ایسی آنکھوں کی کوئی حقیقت نہیں
مردہ آنکھوں کی کوئی حقیقت نہیں
آنکھیں چہرے پہ ہوں تو ڈرا بھی سکیں
آنکھیں زندہ، متحرک بدن پر ہوں، چہروں سے چہروں کی جھاڑی سے نکلیں
تو کھا بھی سکیں
ان کی کوئی حقیقت نہیں
مردہ آنکھوں کی کوئی حقیقت نہیں

اور پھر یہ تو ہوتا ہی آیا ہے

حاکم کو معزول کرنے کی اتنی سزا تو ہمیشہ ملی ہے
کہ جب فتح کے جشن میں

تخت کو اپنی آنکھوں میں بھر کر
نیا حکمراں تاج پوشی کو آگے بڑھے
اس پہ سکّوں کی بارش ہو
سکّے — جو معزول حاکم نے رائج کئے تھے —
مگر ایسے سکّوں کی کوئی حقیقت نہیں
مُردہ آنکھوں کی کوئی حقیقت نہیں
آنکھیں چہرے پہ ہوں تو ڈرا بھی سکیں
آنکھیں زندہ بدن پر ہوں، جسموں کی جھاڑی سے نکلیں
تو کھا بھی سکیں

۱۹۶۹ء

لاشعر

وہ تشبیہہ کے پاک ملبوس میں مجھ سے ملتی تھی
اس نے معانی کی خاموش آواز سے مجھ کو اکثر مخاطب کیا تھا
اور الفاظ کی چبھتی آنکھوں سے بے خواب راتوں میں میرا تعاقب کیا تھا
اور اک بار اس کے غنائی لبوں سے کوئی زیرِلب بات سن کر ——
میں رک بھی گیا تھا
مگر اپنی تکمیل کو وہ ترستی رہی
ان کہی نظم کے درد کو میں نہ جانا

وہ پیہم مجھے استعاروں کے خفیہ دریچوں سے آواز دیتی رہی

میں نے مصروف لمحوں کی دیوار ان استعاروں کے خفیہ دریچوں پہ ڈھک دی
مگر جانے کس نے وہی ان کہی نظم پھر میرے اندر بھی رکھ دی

مجھے کیا پتہ تھا،
وہ گھٹ گھٹ کے مر جائے گی
اور پھر میرے کم سن خیالوں کو اک چپ سی لگ جائے گی
پھر میں دیوانگی میں ادھورے معانی کو آزاد کر دوں گا
اور بانجھ تشبیہوں، ٹوٹے ہوئے استعاروں کو آواز دینے پہ مجبور ہو جاؤں گا
کیا خبر تھی کہ نظمیں بناؤں گا
ہذیان گوئی میں اک عمر کٹ جائے گی
ان کہی نظم آسیب بن جائے گی

سنہ ۱۹۷۰ء

Scanned with CamScanne

محرومی کی تلاش میں

کوئی میری آواز سنتا ہو تو التجا ہے

مرے پاس آ جائے

اور مجھ کو شہرت کے ملبے کے نیچے سے فوراً نکالے

اگر ایسا ممکن نہ ہو تو

مرے دوستوں، میرے اپنوں کو جا کر خبر دے

کہ میں دیکھ سکتا نہیں

سوچ سکتا ہوں، بس

پس مرے دوست اور میرے اپنے

مری سوچ کو سونگھ کر میرے نزدیک آنے کی کوشش کریں
ہو سکے تو مرے ساتھ رو لیں
کہ میں دوستوں اور اپنوں کا پندار تھا
ان کی ساری انا تھا
انھیں دوستوں اور اپنوں کی خاطر بنا تھا

یہ آواز سنتا ہو کوئی تو ان کو خبر دے
کہ گمنامیوں اور محرومیوں کا مزہ یاد آتا ہے مجھ کو
سڑک کتنی ہموار تھی یہ خیال آج ملبے میں دب کر ستاتا ہے مجھ کو
کوئی ان کو جا کر خبر دے کہ
محرومیوں کی فضا مجھ کو چھوڑے ہوئے آج مدت ہوئی
(یہ فراغت ہی کیوں میری قسمت ہوئی)
کوئی فوراً انھیں میرا پیغام دے دے
کہ محرومیوں اور گمنامیوں کی عمارت اچانک گری

اور میں ملبے میں، شہرت کے ملبے میں دبتا گیا

اب یہ صورت ہے:

میں دیکھ سکتا نہیں
سوچ سکتا ہوں بس

پس مرے دوستوں، اور اپنوں پہ واجب ہے
مجھ کو بچانے کی کوشش کریں
میری محرومیوں کی عمارت کو پھر سے بنانے کی کوشش کریں
یعنی ملبہ ہٹانے کی کوشش کریں
کچھ نہیں کر سکیں تو
مری سوچ کو سونگھ کر میرے نزدیک آنے کی کوشش کریں

ستمبر ۱۹۸۱ء

مسافر، بچّے اور دُعا

مسافر نے احسان مندانہ نظروں سے بچّوں کو دیکھا
پھر اک گھونٹ پانی پیا
اور سب کو دعا دی
مسافر نے سب کو دعا دی کہ
تم میں سے کوئی کبھی بھی پریشاں نہ ہو
اور کسی کے لئے درد کا کوئی ساماں نہ ہو
تم کو یہ زندگی راس آئے
اور اس مسئلے کو کسی طور حل کر سکو

جی سکو

مر سکو

اس پہ سب بچے بولے کہ

ایسی دعائیں تو سارے مسافر ہمیشہ سے دیتے چلے آتے ہیں

ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ

جب بھی تھکا ماندہ کوئی مسافر یہاں آنکلتا ہے

بچے اسے پانی لاکر پلاتے ہیں

اور سوچتے ہیں

کوئی کارآمد کوئی بے تحاشا دعا

ان کے حصے میں آجائے گی

ہاں مگر ایسا ہوتا نہیں

بچے بولے

ہمارے بڑوں کو بھی ایسی دعائیں ملی تھیں کہ

تم میں سے کوئی کبھی بھی پریشاں نہ ہو

اور کسی کے لئے درد کا کوئی ساماں نہ ہو
تم کو یہ زندگی راس آئے
اور اس مسئلے کو کسی طور حل کر سکو

جی سکو مر سکو

بچے بولے مگر
جی سکو مر سکو میں سے کوئی دعا بھی تو پوری نہیں ہو سکی ہے
ہمارے بڑے جی نہ پائے مگر آج بھی زندہ ہیں

بچے بولے:
مسافر ہمیں کوئی ایسی دعا دو
جو دل میں تمہارے چھپی ہو
جو ہونٹوں پہ آتی نہ ہو
وہ دعا دو تھکا ماندہ کوئی مسافر جو تم کو نہیں دے سکا
بچے بولے مسافر دعا دو کہ

ہم میں سے کوئی بھی تم سا نہ ہو
یہ سنا تو مسافر کی آواز بھر آئی
اور اس نے ساری شکستوں کی روداد سب کو سنائی

مسافر نے پھر سچے دل سے کہا:
میرے بچو دعا ہے
تمہاری قمیصوں میں کوئی گریباں نہ ہو

سنہ ۱۹۷۹ء

ڈیڑھ بات

شاعری شعر کاری ہے اور اس میں صناعی درکار ہے اسی لئے خیالات و نظریات وغیرہ (مواد) محض ضمنی باتیں ہیں اور ضمنی اہمیت ہی رکھتی ہیں۔ شاعری جتنی پابندیوں میں کی جائے اتنی ہی صناعی بروئے کار آتی ہے اسی لئے غزل کی شاعری بے پناہ ہوتی ہے۔ آزاد شاعری بھی اتنی آزاد نہیں ہوتی جتنی سمجھی جاتی ہے مگر 'آزاد شاعری' اور 'آزاد نظم' جیسے الفاظ کثرتِ استعمال کا شکار ہو گئے جب کہ یہ ہم جانتے ہیں کہ اس شاعری میں بھی کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ بہر حال شاعری کوئی جذباتی عمل نہیں ایک نہایت شعوری حرکت ہے اس لئے بھی کہ اس کی "اشاعت" کی جاتی ہے۔ اگر یہ محض ایک مجذوبانہ عمل ہی ہو تو قافیہ ردیف کی بات تو الگ رہی، ہم اس کی 'اشاعت' کیوں کرتے رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے دوسرے جذباتی اعمال کی بھی اسی طرح اشاعت کرتے ہیں؟ شاعری ہماری ڈائریوں اور ذاتی کاغذات میں کیوں نہیں رہتی؟

موجودہ صدی میں اردو ادب میں 'دو بڑی طاقتوں' کا نمو ہوا ایک نظریہ زدہ اور دوسری نظریہ مخالف یعنی ایک نظریہ سے ملوث اور دوسری نظریہ مخالف شدت سے۔ یہیں سے بات چلتی ہے 'ادب کی تیسری دنیا' (یہ ترکیب میری نہیں) اور اس کی ضرورت کی۔ یہ 'تیسری دنیا' دونوں بڑی طاقتوں کے جبر سے محفوظ ہے یعنی سماجی شعور اور افادی ادب کی زور زبردستی سے بھی اور فرد کی ذات کی تنہائی کے بیکراں کرب کی دست درازی سے بھی۔ میں نے اسی تیسری دنیا میں شاعری کی ہے۔

شجاع خاور